ایک گرجا ایک خندق

ایک گرجا ایک خندق

کرشن چندر

نام کتاب : ایک گرجا ایک خندق
مصنف : کرشن چندر
کتابت : محمد عارف سہسوانی
سن اشاعت : سنہ ۱۹۹۶ء
مطبوعہ : فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی
قیمت : ۱۳۰/- روپے

M/s Asia Publishers,
A-36 Chetak Appt.,
Plot No:27/2 Sector 9,
Rohini, Delhi-85
T.No:7261823

EK GIRJA KE KHENDHAK
by Krishan Chander
Rs.130/-

افسانے

ایشیا پبلیشر

اے 36 ۔ سیکٹر 9 ۔ چیتک اپارٹمنٹس

روہنی ۔ نئی دہلی 85

فہرست

یوکلپٹس کی ڈالی

سبک سار شاخ اس کے سر پر سایہ کیے تھی۔ عام طور پر یوکلپٹس کی شاخ تنے کے اس قدر نیچے نہیں پھوٹتی ہے۔ بلکہ تنے کے بہت اوپر جاکر آسمان کو دیکھ کر لہلہاتی ہے۔ مگر جانے اس شاخ کو زمین سے کیسی محبت ہوگئی تھی کہ تنے کے اس قدر قریب زمین کے پاس پھوٹ نکلی تھی۔ جب وہ ہسپتال کے کاموں سے تھک کر ذرا سکون حاصل کرنے کے لئے اس درخت کے نیچے آبیٹھتا تو یہ شاخ فوراً اس کے سر پر آجاتی۔ اس قدر قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ملا سکتا تھا۔ اس کے لانبے کھلے لچکیلے لرزتے ہوئے پتّوں کو چھو سکتا تھا۔ اس کے مدوّر ملائم مہکتے ہوئے مرمر پر اپنی انگلیاں پھرا سکتا تھا۔ اور آنکھیں بند کرکے چند لمحوں کے لئے اس سکون آمیز لذّت کے لطیف احساس سے اپنی روح کو معمور کرسکتا تھا۔

وہ ایک نوجوان ڈاکٹر تھا۔ اور ڈاکٹر سے زیادہ نوجوان تھا۔ زندگی کا تجربہ اور طبابت کا تجربہ دونوں ابھی اسے حاصل کرنا تھے۔ وہ اس گاؤں کی ڈسپنسری میں وارد تھا۔ اور ابھی اس کے دل میں ایک نووارد کا ڈر اور جھجک دونوں موجود تھے۔ پھر بھی وہ دن رات بڑی محنت اور مستعدی سے کام کرتا تھا۔ علاقے کے ایک سو ساٹھ گاؤں میں، چالیس ہزار کی آبادی میں وہ اکیلا ڈاکٹر تھا۔ طبیب بھی جراح بھی۔ موقعہ پڑنے پر دایہ بھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے کام سے بہت گھبرا جاتا۔ کبھی کبھی اس کی ڈسپنسری میں دوائیاں اس قدر کم ہوجاتیں کہ وہ دوائی کم دیتا اور

ہمدردی زیادہ ۔ اس موقع پر اسے خود اپنے آپ سے بھی ہمدردی محسوس ہونے لگتی ۔ وہ اکیلا کیا کرے ۔ کہاں تک کرے ۔ چالیس ہزار کی آبادی میں دوا کے لئے ساڑھے سات سو روپے کا سالانہ بجٹ کہاں تک چل سکتا ہے جو وزیروں کے بجٹ بڑھاتی ہے ۔ اور ڈاکٹروں کے بجٹ گھٹاتی ہے ۔ وہ خود کہاں تک چل سکتا ہے ۔ اسے ایک مددگار ڈاکٹر کی ضرورت ہے دو کمپانڈروں کی ضرورت ہے ۔ تین نرسوں کی ضرورت ہے ۔ اسے وبائی امراض کے مریضوں کے لئے ایک الگ مستقل وارڈ کی بھی ضرورت ہے ۔ کیوں کہ جہاں مفلسی مستقل ہوتی ہے، وہاں وبائی امراض بھی مستقل ہوتے ہیں ۔ وہاں بڑھتی ہوئی شرح موت بھی ایک فوجی چھاؤنی کی طرح اپنے ڈیرے ڈال لیتی ہے ۔

لیکن ڈاکٹر تو مخالف چھاؤنی کا سپاہی تھا ۔ وہ اکیلا اس بڑھتی ہوئی موت کی یلغار کیسے روکے گا ۔ اس کے مددگار کتنے کم تھے ۔ اس کے پاس ہتھیار کتنے کم تھے ۔ اور کبھی کبھی تو اسے ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ کسی غلط راستے پر جا رہا ہو ۔ بیماری کچھ اور ہے ۔ علاج وہ کچھ اور ہی کر رہا ہے ۔ خاص کر ان دنوں جب سارے علاقے میں خونی پیچش کی بیماری ایک وبا، کی طرح پھیلی ہوئی تھی ۔ ان دنوں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے ۔ وہ پیچش ٹھیک کر دیتا تھا ۔ اور مریض کو پھر پیچش ہو جاتی تھی ۔ وہ پھر سے ٹھیک کر دیتا تھا ۔ اور وہ پھر آجاتی تھی ۔ اس لئے نہیں کہ اس علاقے کے لوگوں کی آنتیں کمزور تھیں ؛ بلکہ اس لئے کہ ان کی جیبیں کمزور تھیں ۔ گھر اناج سے خالی تھے ۔ اور دیہات قحط سے روندے ہوئے تھے ۔ لوگ پتے اُبالتے تھے ، اور درختوں کی چھال اُبالتے تھے ۔ اس لئے پیچش ضروری تھی ۔ اس قدر لازمی کہ اگر انسان کے جسم میں آنتیں نہ ہوتیں تو یہ پیچش معدے میں ہو جاتی یا پھیپھڑوں میں ہو جاتی یا کان میں ہو جاتی مگر ہوتی ضرور ۔ یہی سوچ کر اسے کبھی اس قدر غصہ آتا کہ وہ محسوس کرنے لگتا کہ وہ ڈاکٹر نہیں ہے ، حجام ہے ۔ وہ مرض کا علاج نہیں کر رہا ہے اس کے بڑھے ہوئے بال کاٹ رہا ہے ۔ تھوڑا عرصہ گذرتا ہے کہ بال پھر بڑھ جاتے ہیں ۔ یقیناً وہ ڈاکٹر نہیں ہے ، حجام ہے صحت کا سپاہی نہیں ہے ۔ گھسیارا ہے ۔ یہ نہیں کہ اسے حجاموں یا گھسیاروں سے کسی طرح کی نفرت تھی ۔ وہ انھیں

ڈاکٹروں کی طرح قابلِ عزت سمجھتا تھا۔ مگر وہ پیشوں کے گڈمڈ کر دینے کے خلاف تھا۔ ڈاکٹر کو ڈاکٹر کا اور گھسیارے کو گھسیارے کا کام کرنا چاہئے ۔

یہی سوچ سوچ کر جب اس کی پریشانی بہت بڑھ جاتی تو وہ جھنجھلا کر ہسپتال سے باہر نکل آتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، آستین اوپر چڑھائے، ماتھے پر تیوری کے بل لہرائے ہسپتال کے باغیچے سے گذر کر اس ڈھلوان پر آجاتا جہاں یوکلپٹس کا پیڑ کھڑا تھا۔ اور جب اس کے تنے سے پیٹھ لگا کے بیٹھ جاتا اور گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھتا تو اسے صرف ہسپتال کی چھت نظر آتی ۔ اور ڈھلوان کے کنارے کنارے کھلا ہوا لالہ اپنے درخشاں دانتوں سے کھلکھلا کے ہنستا ہوا نظر۔ اور وہ مسکرا کر ہسپتال کی چھت سے اپنی نظریں پھیر لیتا۔ اور گردن گھما کے سامنے دیکھنے لگتا۔ اور معًا وہ یوکلپٹس کی ڈولتی شاخ، جھومتی شاخ کسی نازک اندام حسینہ کی مخروطی انگلیوں کی طرح اس کے رخساروں کو چھولیتی۔ اور وہ سر شاخ جھومتی ہوئی پتیوں کو جھکا کر انھیں اپنے رخساروں سے لگا لیتا۔ اور پھر یکایک ایک ملائم سا پتہ اس کی انگلیوں میں ٹوٹ جاتا ۔ اور وہ شاخ اُچک کر چھریرا بدن چرا کر ہزار خم کھا کر اس کے ہاتھوں سے بلند ہو جاتی۔ اور اس کے شوخ پتوں کے شریر جھوموں سے ہزار قہقہوں کی صدا بلند ہوتی۔ اور وہ یکایک خوش ہو کر اطمینان کا سانس لے کر سامنے وادی کی جانب دیکھنے لگتا۔ اور وادی سے پرے نیلگوں گھاٹیوں پر ایستادہ شاہ بلوط کے چھتارے دار اور بیار کے مینار کسی کہنہ مسجد کا سا تقدس اور احترام لئے کسی موذن کی صدا کے منتظر معلوم ہوتے۔ اور وہ سوچتا کہ یہ دُنیا کتنی حسین ہے، کتنی حسین تر ہو سکتی ہے۔ اگر ....

نہیں۔ نہیں اس وقت وہ کسی اگر مگر کو نہیں سوچے گا۔ اس وقت دوپہر ہے اور وہ تھکا ہوا ہے اور اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ اسے ابھی کوئی دو سو مریضوں کو اور دیکھنا ہے۔ اس لئے وہ ابھی کسی اگر مگر کو نہیں سوچے گا۔ وہ بس چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر کے یوکلپٹس کی شاخ کے نیچے سوئے گا ئے گا۔ سو جائے گا۔ کھو جائے گا۔ ندی بہہ رہی ہے۔ ہوا چل رہی ہے، پتوں کے سبز آنچل اس کی آنکھوں پر بکھر گئے ہیں۔ نیند دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ سو رہا ہے۔ وہ کھو رہا ہے۔ وہ سو۔ وہ کھو..... نا

یکایک وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اور آنکھیں مل کر پھر دیکھنے لگا۔ کہیں یہ خواب تو نہیں۔ اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اور وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پیپ، پھوڑے اور ناسوروں سے بھرے ہوئے علاقے میں، وبائی امراض سے گھری ہوئی قحط زدہ وادی میں، اس قدر خوبصورت لڑکی کہاں سے آگئی؟ بال سنہلے اور پھیلے ہوئے۔ شاہ بلوط کے چھتارے کہ سورج کی کرنوں کے گچھے کہ چناروں سے پھوٹتے ہوئے شعلے۔ آنکھیں بڑی بڑی، پُتلیاں گہری اور سیاہ غمگسار اور ہندوہناک، اتھاہ اور پُر اسرار۔ کائنات کے اسرار و رموز اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے۔ ناک ستواں اور شمشیر کی طرح لپلپاتی ہوئی۔ تڑپتے ہوئے حساس نتھنے رخسار اس قدر سپید اور ہونٹ اس قدر سُرخ گویا جسم کا سارا لہو کھنچ کر ان ہونٹوں میں آگیا ہو۔ وہ ان ہونٹوں کو دیکھ کر کانپ گیا۔ اس نے اپنی نظر نیچے جُھکائی۔ تو اسے اس لڑکی کا چھریرا کلاسکی بدن، ایک نیلی قمیض اور پتلی شلوار میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ دائیں شانے سے نیلی قمیض کا کپڑا پھٹ گیا تھا۔ اور اس میں سے اس کا سفید بدن یوں جھانک رہا تھا، جیسے کسی ویران نیلے اُفق پر کوئی پارۂ ابر۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں مل کے دیکھا۔ ہاں وہی تھی۔ اس کے سامنے تھی اور اسے جاگتے دیکھ کر اپنی دلیری پر خود ہی شرما کر ذرا پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"معاف کرنا میں نے تمھیں جگا دیا۔ مگر مجھے دوائی کی سخت ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر کچھ نہ بولا۔ اس نے ہاتھ کے اک ہلکے سے اشارے سے لڑکی کو اپنے پاس بیٹھ جانے کو کہا۔ لڑکی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اسے اپنا حال بتانے لگی۔ وہ کچھ سُن رہا تھا۔ کچھ نہیں سُن رہا تھا۔ اس کی سانس ایک عجیب ناہمواری سے چل رہی تھی۔

"میں بہت دُور سے چل کر آئی ہوں۔ (تم شاید ستاروں سے بھی بہت دور سے چل کے آئی ہو) گوراگھیل میرے گاؤں کا نام ہے۔ (گوراگھیل۔ گوراگھیل۔ گوری کہیں یہی میرے احساس کی منزل تو نہیں) فتح دین میرے باپ کا نام ہے۔ (ہاتھ میں درانتی لئے ہوئے بھوری ڈاڑھی خندہ پیشانی) میرا نام نازاں ہے (نازاں۔ نازاں۔ محبّت بھرے لہجے میں تجھے پُکار لوں، نازاں۔ نازاں، ہوا کی سسکی کی طرح نازک تر نام ہے) میرے باپ کو خُونی پیچش ہے۔ (کوئی اور بات کرو) وہ پندرہ دن سے لیٹا ہوا ہے (نہیں نہیں کوئی اور بات

کرو۔ کیا تم بھی اسی سرزمین کی ہو ؟ کیا تمھارے باپ کی بھوری ڈاڑھی نہیں ہے، خندہ پیشانی نہیں ہے ؟ کیا وہ بھی درد سے کراہ رہا ہے) ہمارے گھر میں کچھ نہیں ہے (کسی کے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ نہیں نہیں، میں اپنے کانوں میں اُنگلیاں دے لوں گا نازاں اور انجم کی بات کرو۔ آسمان پر رقص کرتی ہوئی اپسراؤں کی بات کرو) زمیندار نے لنگر کھول رکھا ہے (دولتانے، ٹوانے، برے ٹاٹے، نون، اصفہانی۔ نازاں مجھے پاگل مت بناؤ۔ دیکھو یہ آسمان کس قدر خوبصورت ہے، پُر اسرار اور مُبہم ہے۔ بلیک کی شاعری کی طرح) وہاں صبح کو سب کو آدھی روٹی ملتی ہے۔ (پھر وہی روٹی۔ دیکھو جھیلوں میں پانی رُکا ہوا ہے۔ لالہ ہنس رہا ہے۔ یوکلپٹس کے پتّے تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہواؤں میں خیام کے مصرعوں ایسی خوشبو ہے) آدھی روٹی ٹکی کی۔ پہلے ایک ملتی تھی۔ اب آدھی ملتی ہے سُنا ہے اگلے جمعہ سے ایک چوتھائی ملے گی۔ پھر کیا ہوگا ڈاکٹر۔ پھر کیا ہوگا۔ ڈاکٹر میرا باپ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اب تو اس سے بات بھی نہیں کی جاتی، میں پندرہ کوس سے چل کے آئی ہوں۔ مجھے کوئی بہت اچھی دوا دو۔ میرا باپ اچھا ہو جائے گا نا ؟ نہیں اچھا ہوگا تو میں یتیم ہو جاؤنگی میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں ہے ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ تم بولتے کیوں نہیں ڈاکٹر......"

ڈاکٹر یکایک اُٹھ کھڑا ہوا اور ہسپتال کی طرف چلنے لگا۔ نازاں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے پیچھے چلنے لگی۔

خونی پیچش کے لئے وہ سب کو سترہ نمبر کا مکسچر دیتا تھا۔ بھورے رنگ کا سیال، جو ایک فولاد کے بڑے ڈول میں بھرا ہوا تھا۔ اس ڈول کے مُنہ پر کھدر کا ایک گیلا کپڑا پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹونٹی گھما کے مکسچر نکالنا چاہا۔ پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ کیا میں اس کو بھی دھوکا دوں ؟ یہ دوا ہے کہ احساس کا فریب ؟ کہ سماج کی چارسوبیس ہے ؟ نازاں تیرے چہرے پر کس قدر بھول پن ہے۔ کس قدر یقین ہے کیا تو سچ مچ یہ سمجھتی ہے کہ یہ بھورا سیال جو ایک آدمی تو کیا ایک گلہری کی انتڑیوں کو بھی ٹھیک نہیں کرسکتا تیرے باپ کو اچھا کر دے گا ؟ آخر نازاں تو میری کیا لگتی ہے ؟ میں کیوں تجھے دھوکا نہ دوں جب مجھے اسی لئے ملازم رکھا گیا ہے ؟ اسی لئے مجھے تنخواہ دی جاتی ہے تو میں اپنا فرض

کیوں نہ پورا کر دوں لا اپنی بوتل ۔ میں اس میں سترہ نمبر کا مکسچر ڈال دیتا ہوں ہر روز سیکڑوں بیمار یہی مکسچر خوشی خوشی لے جاتے ہیں ۔

لیکن ڈاکٹر سترہ نمبر کے مکسچر کے قریب جا کے پلٹ آیا ۔ اس نے سوچا وہ نازاں کی تشکر آمیز مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکے گا ۔ یہ مُسکراہٹ جو ایک میٹھے خنجر کی طرح ہمیشہ اس کے سینے میں پیوست رہے گی ۔ آہستہ آہستہ اس میں سے لہو رستہ رہے گا ۔ آہستہ آہستہ ڈاکٹر ہسپتال سے باہر چلا گیا ۔ نازاں کے چہرے پر مایوسی دوڑ گئی ۔ بولی ۔ دوا نہیں دو گے ڈاکٹر ۔ پیسہ چاہتے ہو ۔ ڈاکٹر مگر میرے پاس پیسے تو کچھ بھی نہیں ہیں ۔

ڈاکٹر نے نازاں کو دس سیر چاول دیئے نمک کا ایک ڈھیلا ۔ تھوڑی سی دال ۔ اور سیاہ مرچ اور ان سب کو باندھ کر نازاں کے سورج مُکھی کی طرح چمکتے ہوئے سر پر رکھ دیا ۔

نازاں حیرت سے بولی ۔ اور دوا !

ڈاکٹر نے کہا ۔ بس یہی دوا ہے ۔

نازاں کھڑی کھڑی ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہی ڈاکٹر اس کی طرف دیکھتا رہا ۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی ۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا ۔ شاید وہ دونوں کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے ۔ اس لئے دونوں میں سے کسی کی زبان نہ کُھلی ۔ اور وہ لمحہ گذر گیا ۔ لمحہ جو بیحد نازک لطیف اور نا پائیدار تھا ۔ لمحہ جو کچھ ہو سکتا تھا ۔ کسی کی بانہوں کا سہارا ، کسی کی زندگی کی مشعل ، کسی کے سینے کی حقیقت ۔ وہ لمحہ گذر گیا ۔ اور ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہوا ۔ جیسے اس کے دل میں کوئی میٹھا خنجر اُتر گیا ۔ دوسرے لمحے میں دونوں اجنبی تھے ۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی ۔ وہ رسماً اسے جواب دے رہا تھا ۔ ' کبھی گورا گھیل آؤ ۔ ہاں میں ضرور آؤں گا ۔ میرا باپ تمھیں دُعائیں دے گا ۔ میں کس لائق ہوں ۔ سلام ۔ سلام '

ابابیل اُڑ گئی ۔ آسمان خالی ہو گیا ۔

جب وہ بہت دور چلی گئی تو یکا یک ڈاکٹر کی ہمت عود کر آئی ۔ اور اُس کا جی مچل اُٹھا کہ وہ بھاگ کر نازاں کو اپنی بانہوں میں لے لے ۔ اور اس کی حیران پتلیوں پر اپنے ہونٹ رکھ دے ۔ اور اس سے غیر فانی محبت میں وہ سب کچھ کہہ دے جو غیر فانی محبت ہمیشہ کہتی چلی

آئی ہے۔

ڈاکٹر کے دونوں بازو آگے بڑھے۔ مگر قدم آگے نہ اُٹھ سکے پھر بازو بھی گر گئے۔ اور وہ اپنے ایک لمحے کی جسارت پر خود ہی شرمندہ ہوکر واپس اپنے ہسپتال کو لوٹ گیا۔

رات اس نے اپنے حکام اعلیٰ کو لکھا کہ اس علاقے میں ہسپتال اگر بند کر دیا جائے اور اس جگہ ایک لنگر خانہ کھول دیا جائے تو وبا دب سکتی ہے۔

اس کے جواب میں حکام اعلیٰ نے اس کا تبادلہ گاؤں سے شہر میں کر دیا۔ خیریت گذری ورنہ وہ اس جسارت پر اسے برخاست بھی کر سکتے تھے۔

شہر میں آکے وہ گاؤں کی وبا کو تقریباً بھول سا گیا۔ یہاں شہر میں لوگ اکثر کھاتے پیتے اور خوش حال تھے۔ سفید پوش لوگ، دوکاندار۔ حاکم۔ حاکموں کی اولاد، جاگیرداروں کے جوان سائیس۔ یہاں دوسرے امراض ملتے دوسری وبائیں تھیں ڈاکٹر اپنے ہسپتال کے کام میں مصروف ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اسے یہ خیال ستانے لگا کہ اس نے خواہ مخواہ حاکم اعلیٰ کو رپورٹ لکھی۔ اور اپنی کیرکٹر بک کو داغدار کر لیا۔ کوئی مرے کوئی جئے اس کی بلا سے۔ کیا اسے ہر ماہ کی پہلی کو تنخواہ نہیں مل جاتی ہے؟ کیا اگلے سال اس کی ترقی نہیں ہونے والی ہے؟ کیا آخر لوگ اس سے عزت سے نہیں پیش آتے ہیں؟ یہ سب کچھ چھوڑ کے بیکاری کا جھنڈا ہاتھ میں لے کے وہ ملک اور قوم کی کون سی خدمت سرانجام دے لے گا۔

اونہہ۔

ڈاکٹر نے گھوم کر ہسپتال سے باہر دیکھا۔ ہسپتال سے باہر اسے دور تک چھتوں کی قطار نظر آئی۔ چھتوں کے پرے چھتیں۔ ان سے بھی پرے چھتیں۔ ان کابکوں میں کس قدر آرام ہے۔ ڈاکٹر نے ایک اصیل کبوتر کی طرح اپنے شانے سکوڑے، اپنی گول چکنی ٹھوڑی کو ایک سکون آمیز انداز میں سہلایا اور ڈسپنسری کے اندر چلا گیا۔

ایک دن جب وہ ہسپتال کی کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے ابا کا خط آٹھویں بار پڑھ رہا تھا،

جس میں انھوں نے اس کے لئے شادی کا رشتہ ٹھیک کیا تھا ، اسے وزیر فیروز چند کا ٹیلیفون آیا ۔ "جلدی سے آجائیے ڈاکٹر صاحب ۔ ایک ضروری کام ہے ۔ میں فٹن بھیج رہا ہوں ۔"
ڈاکٹر نے خط کو تہہ کر کے سنبھال کے اپنی جیب میں رکھا اپنا بیگ تیار کیا ۔ اتنے میں وزیر صاحب کی فٹن آگئی اور ڈاکٹر اس میں بیٹھ کر وزیر صاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا ۔

وزیر فیروز چند کی کوٹھی شہر سے باہر ایک پہاڑی پر واقع تھی ۔ کوٹھی کے باہر سن کے درختوں سے انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں ۔ اور شہد کے چھتوں میں مکھیاں اپنے شیریں کاروبار میں مصروف بھنبھناتے ہوئے آتی جاتی ہوئیں اک پُرسکون آرام دہ منظر پیش کر رہی تھیں ۔ کوٹھی کے دروازے کے باہر سپاہی پہرہ دیتے ہوئے اونگھتے ہوئے معلوم دیتے تھے ۔ چاروں طرف ایک بھیگی بھیگی خاموشی ۔ غنودگی میں لپٹی ہوئی تھی ۔ جیسے فضا نے انگور کے گچھوں سے ساری شراب کشید کر کے خود پی لی ہو اور اس کا کیف آور سُرور چاروں طرف پھیلا دیا ہو ۔ فٹن پر بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر کو نیند آنے لگی ۔ اور اسے اس وقت پتہ چلا کہ وہ وزیر صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر ہے ، جب سنہری وردی میں ملبوس کوچوان نے آکے سامنے کا دروازہ کھول کر کہا ۔ "حضور"

ڈاکٹر نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں اور اپنے بیگ پر ہاتھ رکھا کیوں کہ وزیر فیروز چند کوٹھی کے دروازے پر کھڑے بڑے پُرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کر رہے تھے ۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب آئیے ۔"

وزیر فیروز چند کا گورا مُسکراتا ہوا چہرہ اس کی خندہ پیشانی اس کے ہاتھ کا مضبوط مصافحہ ڈاکٹر کے لئے ایک نشے سے کم نہیں تھا ۔

ڈاکٹر کا چہرہ مسرت سے کھل گیا ۔ وزیر فیروز چند اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے پُرانے دوستوں کی طرح اسے کوٹھی کے اندر لے گئے ۔

کیسی خوبصورت سجی ہوئی کوٹھی تھی ۔ پردے کتنے قیمتی اور خوش رنگ تھے ۔ دیواروں پر پُرانی راجپوتی مصوری کی تصویریں کیسی صناعی سے ابھاری گئی تھیں ۔ قالین کتنے دبیز تھے ۔ گویا وہ پھولوں کے تختے پر چل رہے تھے ۔ ہر قدم گلاب تھا ہر سانس عطر بیز ۔ اور وزیر فیروز چند

بڑے مہربان لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی ترقی کی درخواست میں نے منظور کرلی ہے۔ کل آپ کو میری منظوری کی سرکاری اطلاع مل جائے گی۔ ڈاکٹر جھک کر کورنش بجالایا۔ وزیر فیروز چند کس قدر اچھا حاکم ہے۔ کس قدر مہربان اور شفیق۔ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے۔

ڈاکٹر چلتے چلتے اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وزیر فیروز چند ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، اسے کوٹھی کے مردانے کی غلام گردش سے گھما کر زنان خانے کی طرف لے جانے لگا۔

زنان خانے کے دروازے پر جاکے وہ رُک گیا۔ دروازے پر کھڑی ایک خادمہ سے اشارہ کیا۔ وزیر ڈاکٹر کو ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گیا۔

چند نسوانی قہقہوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ خادمائیں اِدھر اُدھر بھاگیں۔ رنگین لباسوں کے ریشم ڈاکٹر کی نگاہوں کو خیرہ کرتے گئے۔ اب وہ ایک کمرے میں کھڑا تھا جس کی زرنگار چھت پر ایک بلوریں فانوس لٹک رہا تھا اور جس کے نیچے ساگوان کی ایک منقش مسہری پر موتیوں سے مزین جھالروں والی جالی کے اندر ایک عورت سو رہی تھی۔ ڈاکٹر کا دل دھک سے رہ گیا۔ نازاں!

وہ صرف نازاں کا رُخ دیکھ سکتا تھا۔ صرف ایک رُخ۔ ایک ابرو۔ پلکوں کی ایک آراستہ صف۔ سُرخ ہونٹوں کا ایک باریک پتلا کونا۔ کان کی ایک لو۔ کرن کے پھول سے اُلجھتی ہوئی زلف کی ایک لٹ۔ گردن کا ایک خم۔ ایسی صاف سفید ملائم بے داغ گردن جیسے خراد پر ڈھالی گئی ہو۔ یکایک یوکلپٹس کی ایک شاخ کہیں سے اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں سبز اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔

وزیر فیروز چند نے کہا۔ بہت ہی آہستہ سے۔ "اس کے لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔"

ڈاکٹر چُپ رہا۔

وزیر نے کہا۔ "دو تین روز سے یہ کچھ کھاتی نہیں۔ جو کھاتی ہے قے کر دیتی ہے۔ کل رات بھر جاگتی رہی۔ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی ہے۔ کہیئے تو جگا دوں؟"

وزیر فیروز چند نے آخری فقرہ ایسے انداز میں کہا کہ گویا وہ اسے جگانا نہیں چاہتا۔ مگر ڈاکٹر نے اصرار کیا۔ "جگانا تو پڑے گا۔ ورنہ میں معائنہ کیسے کرسکوں گا۔"

وزیر فیروز چند نے ایک لمحہ کے لئے ملتجانہ انداز میں ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی سرد مہری

دیکھ کر وہ مسہری کی طرف آگے بڑھ گیا۔ آہستہ سے اس نے جالی کھول کے سوئی ہوئی مورت کو جگایا۔ پہلے اس کی زلف کی لٹ کو سنبھالا۔ اور پھر اُس کے رُخسار کو تھپتھپایا۔ پھر اس کے کندھے کو ایک ہلکی سی جنبش دی۔ نازاں اک انگڑائی لے کے بصد ناز و ادا اُٹھی۔ اور وزیر فیروز چند کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اس نے اپنا ہیرے کے کنگنوں والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اس کی نظریں ڈاکٹر پر پڑیں۔ اور وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کے سہم گئی۔

وزیر فیروز چند نے ہنس کے کہا۔ "کوئی اجنبی نہیں ہے۔ ہمارا ڈاکٹر ہے۔ تمھارا علاج کرنے آیا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ دو منٹ کے لئے باہر جا سکتے ہیں۔"

"ضرور ضرور"

وزیر فیروز چند ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے مسہری پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ نازاں کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دیواریں گھوم رہی تھیں۔ فانوس گھوم رہا تھا۔ اور قالین اس پر ہنس رہا تھا۔ اُسے آخر کار نازاں کی طرف دیکھنا پڑا۔ جو نگاہیں نیچی کئے بار بار اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے پوچھا کیا تکلیف ہے؟"

نازاں دیر تک چپ رہی۔ آخر بولی۔ "پیٹ سے ہوں۔"

"پھر؟"

پھر بہت عرصہ تک خاموش رہی۔ دور دور تک چڑھتے ہوئے جذبات کی لہریں ساحل پر پھیل گئیں۔ پھر ڈاکٹر کے دل میں جذبات کی شام آگئی اور اس نے محسوس کیا جیسے اندھیرا آہستہ آہستہ اس کی رگوں اور شریانوں میں پھیل رہا ہے۔

"وزیر صاحب حمل گرانا چاہتے ہیں۔" نازاں بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"پھر؟" ڈاکٹر نے کہا۔

پھر وہی خاموشی تھی۔ وہی تو ایک لمحہ تھا۔ مگر ڈاکٹر نے محسوس کیا۔ جیسے اس ایک مختصر سے لمحے میں ایک عُمر کی مسافت طے کر لی ہے۔ کیوں کبھی ایک قطرہ قلزم بن جاتا ہے؟ ایک

تبسّم کے اندر کتنے ہی آنسو کیوں چھپے ہوئے ہوتے ہیں ؟ ایک لمحہ میں کتنی ہی صدیاں کیوں چھپی ہوتی ہیں ؟ یہ لمحہ کیسا ہوتا ہے ؟ یہ لمحہ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

نازاں نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں۔"

"کیوں ؟"

نازاں مُنھ پھیر کر باہر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اُدھر دیکھتے دیکھتے آہستہ سے بولی۔ "کیوں کہ میں اُن کی رکھیل ہوں۔"

اب ہر چیز قرینے سے رکھی تھی۔ نہ قالین ہنس رہا تھا۔ نہ دیواریں گھوم رہی تھیں۔ نہ فانوس جُھول رہا تھا۔ ایک کمرہ تھا۔ ایک مسہری تھی۔ ایک عورت تھی۔ سب کچھ وہی تھا صرف جہاں ایک دل تھا وہاں ایک پتھر تھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تمھارا باپ کہاں ہے ؟"

"وبا میں مرگیا۔"

ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا پھر بند کردیا۔ ڈاکٹر سیدھا اُٹھ کھڑا ہوا۔ نازاں کا ہاتھ اُٹھا۔ اس کے ہونٹ کُھلے، پھر بند ہو گئے۔ ہاتھ مسہری پر گر گیا۔ اس نے ایسی گرسنہ نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا جیسے ان نگاہوں کے اندر کے زینے کُھل گئے ہوں۔ اور وہ اسے اپنی روح میں اُتر جانے کو کہہ رہی ہو۔ اسے اپنے سینے سے لگا لینے کو کہہ رہی ہو۔ 'دیکھو دیکھو ڈاکٹر میرے اندر جھانک کر دیکھو۔ میں وہی ہوں پاکباز۔ عفیفہ۔ سورج کی بیٹی نازاں۔'

یکایک نازاں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور سسکیاں لے لے کے کہنے لگی۔

"ڈاکٹر تم گورا گھیل کیوں نہیں آئے ؟ ڈاکٹر تم گورا گھیل، ..."

ڈاکٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات کو اس نے اپنے کوٹ کے اندر سے اپنے آبا کا خط نکالا۔ اس کی تہوں سے کو ٹھیک کیا۔ اسے ایک بار شروع سے آخر تک پڑھا۔ اور پھر اسے پھاڑ کے پھینک دیا۔

اس کے بعد وہ کاغذ قلم لے کے بیٹھ گیا اور وزیر صاحب کے نام اپنا استعفیٰ

لکھنے لگا۔

بہت سال گزر گئے۔ ڈاکٹر اب بُڈھا ہوگیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت لٹک گیا تھا۔ اس کا پیٹ باہر نکل آیا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ جب تک پریکٹس کرتا رہا۔ اپنے شہر کا کامیاب ترین جرّاح سمجھا جاتا رہا۔ چیرنے پھاڑنے میں دُور دور تک اس کے ہاتھ کی صفائی کی شہرت تھی۔ مگر اب اس نے پریکٹس بھی چھوڑ دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ گو اس نے عُمر بھر شادی نہیں کی۔ لیکن اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے بیٹے کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ اسے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اور اب مسعود ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت میں منسلک ہو کے شہر سے دور ایک گاؤں میں سرکاری ڈاکٹر تعینات ہوا تھا۔

مسعود کا خط اس کے سامنے تھا۔ اور وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے پڑھ رہا تھا۔ مسعود نے اپنے بزرگ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا تھا اسے گاؤں میں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور بہت بہت اصرار کیا تھا۔ بُڈھا مسعود کی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ مسعود کی موجودگی بُڈھے کے لئے عادتِ ثانی بن چکی تھی۔ اور اب وہ اس نوجوان کی غیر حاضری کو بُری طرح سے محسوس کر رہا تھا۔

بڈھے ڈاکٹر کی آنکھیں مسعود کے بارے میں سوچ کر دھندلی ہوگئیں۔ اس نے اپنا چشمہ اُتار کے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رومال سے چشمے کو صاف کیا۔ اور بُڈھے جانثار ملازم داؤد کو سفر کی تیاری کا حکم دیا۔

جوں جوں گاؤں قریب آتا جاتا، بُڈھے کے دل کی حرکت تیز ہوتی جاتی تھی۔ ہاں یہ وہی گاؤں تھا جہاں وہ ڈاکٹری پاس کر کے پہلی بار تعینات ہوا تھا۔ وہی ندی تھی۔ وہی دھان کے کھیت تھے۔ وہی پہاڑوں پر شاہ بلوط کے درخت تھے۔ اور دور کے پہاڑ کی چوٹی پر برف چمک رہی تھی۔ یہی برف اس کے سر پر جمی تھی۔ اور وہ ٹٹو پر بیٹھے بیٹھے ایک ایک قدم گن رہا تھا۔ ہر قدم وہ اپنی جوانی کے قریب آرہا تھا۔

ہسپتال کے قریب پہنچ کر وہ ٹٹو سے نیچے اتر پڑا۔ اور داؤد سے چھڑی لے کے پیدل ہوئے ہوئے چلنے لگا۔ یہ کمپونڈر کا کوارٹر تھا۔ یہ ڈاکٹر کا بنگلہ تھا۔ وہی بنگلہ تھا۔ بنگلے کے باہر وہی ناشپاتی کا پیڑ تھا بڑا ہو گیا تھا، پھیل گیا تھا۔ مگر وہی پیڑ تھا۔

ڈاکٹر نے نظر گھما کے اُوپر ہسپتال کی طرف دیکھا۔

ڈھلوان پر وہی یوکلپٹس کا درخت تھا مگر کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا سینہ زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اور اپنے سینے میں سانس ایک پھانس کی طرح چبھتی ہوئی معلوم ہوئی کیوں کہ یوکلپٹس کی ایک شاخ پکڑے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ہو بہو نازاں وہی نیلے بال۔ وہی گورا چہرہ۔ وہی چھریرا کلاسکی بدن۔ اس کی نیلی قمیض پر چاندی کے بٹن چمک رہے تھے۔ اور اس کے گلے میں چاندی کی ہنسلی تھی۔

'نازاں ہے۔ نہیں۔ یہ نازاں نہیں ہے۔ نازاں.....

یکایک مسعود بنگلے سے باہر نکل آیا اور اپنے بزرگ سے لپٹ گیا۔ بڈھے ڈاکٹر نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مسعود کو اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔

مسعود نے بار بار بڑی مسرت اور خوشی سے کہا۔ "مجھے اُمید نہ تھی آپ آئیں گے۔ اوہ میں کس قدر خوش ہوں ابا جان۔"

مسعود کے مُنہ سے ابا جان سُن کر بڈھے ڈاکٹر کا سینہ دونا ہو گیا۔

مسعود نے بڈھے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "اندر چلئے نا۔"

یکایک مسعود کی نگاہیں یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف گئیں۔ جہاں وہ لڑکی شاخ کو جھلاتے ہوئے کھڑی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھکا۔ رُکا۔ پھر اس نے مُڑ کر بڈھے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چلئے میرے ساتھ اندر چلئے نا ابا جان......"

بڈھے ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ مسعود سے چھڑا لیا۔ آہستہ سے بولا۔ "نہیں بیٹا۔ پہلے تم وہاں سے ہو آؤ......"

بڈھے نے یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

مسعود شرما گیا۔

بڈھے نے کہا۔" کوئی نہیں جانتا کل کیا ہو جائے ۔ ابھی دوسرے لمحے میں کیا ہو جائے...... ایک لمحہ میری زندگی میں بھی آیا تھا ۔ مگر میں نے اسے کھو دیا ۔ اب تم وہی غلطی کر رہے ہو جاؤ۔ میرے بیٹے جاؤ۔ کیوں کہ خدا انتظار کر سکتا ہے مگر محبت انتظار نہیں کر سکتی ۔ ان گنت صدیوں کے بعد ایک لمحے کے لئے میں اپنے خدا کے پاس گیا ۔ اور اس نے مجھ سے پیار کیا ۔ اس نے بڑی شفقت سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔ اور میں اپنے خدا سے خفا ہو کے چلا آیا کیوں کہ مجھے شفقت پسند نہ تھی ۔ پھر ایک لمحے کی بھول کے بعد ان گنت صدیوں تک میں اپنے معبود کے پاس جاتا رہا ۔ لیکن ایک لمحے کے لئے اس نے مجھ سے بات نہ کی ۔ کیوں کہ جب وہ بات کر سکتا تھا اور میں سن سکتا تھا وہ لمحہ گذر چکا تھا خدا وقت کا خالق ہے ۔ لیکن محبت وقت کا تبسم ہے ۔ احساس کا سورج ہے ۔ کون و مکاں کی کہکشاں ہے ۔ تم ابھی جاؤ گے میرے بیٹے اور اس سے وہ سب کچھ کہہ دو گے جو میں نہ کہہ سکا......"

مسعود کا چہرہ اپنے روماانی باپ کے لئے بڑے فخر اور غرور سے روشن ہو گیا ۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر جھکا لیا ۔ اور پھر گھوم کر یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف چلا گیا ۔ ڈاکٹر اس کی طرف دیکھتا رہا ۔ جب تک مسعود یوکلپٹس کے پاس نہیں پہنچ گیا ۔ جب تک اس نے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے لیا ۔ اس وقت تک بڑی بے صبری سے اُدھر دیکھتا رہا ۔ پھر وہ آہستہ سے گھوم گیا ۔ اس کی آنکھیں دھندلی ہو گئیں ۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے چشمے کو درست کیا ۔ اور ناشپاتی کے بڈھے تنے سے ٹیک لگا کے اوپر پہاڑوں کو دیکھنے لگا ۔

آج ہواؤں پر نازاں کی زلفوں کی خوشبو تھی اور شفق کے ہونٹوں پر اس کے لبوں کی سُرخی تھی اور اس کا نیلا پیراہن اُفق تا افق پھیلا ہوا تھا ۔ اور دور دور تک شاہ بلوط کے گنبدوں دیودار کے کنگروں ، اور بیار کے روشن میناروں ، تلے گویا ہزاروں مسجدوں سے مقدس اذان بلند ہو رہی تھی ۔ ●

آخری بس

آخری بس ورسوا کے لئے تیار تھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ اس کے بعد کوئی بس ورسوا نہیں جائے گی۔ گیارہ بجے کے بعد جسے ورسوا جانا ہو وہ پیدل جائے یا دو روپے کی گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ یا تین روپے کی ٹیکسی لے۔ ورسوا بس اسٹینڈ سے تین میل دور ہے۔ رستہ سنسان اور ویران نشیبوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ سڑک کے دو رویہ کناڈ کے بڑے بڑے ڈراؤنے جھاڑ ہیں۔ جو چوری چکاری قتل وخون کے لئے بڑی عمدہ پناہ گاہوں کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ اکا دکا مسافر اکثر لوٹے جاتے ہیں اور خودکشی یا قتل کے لئے بمبئی کے لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں، جن کا اخباروں میں چرچا ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے بس اسٹینڈ پر جو ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا گھوڑا گاڑی والے ہیں، وہ اکثر سندھ کے مکرانی یا سرحد کے نڈر پٹھان ہیں اور ہر وقت اپنے پاس خنجر رکھتے ہیں۔ رات کو اکثر پیئے ہوئے ملتے ہیں۔ اس پر بھی یہ لوگ کبھی اکیلے دوکیلے سفر نہیں کرتے۔ بدمعاشوں اور موالیوں کا کیا بھروسہ بھئی۔

اس لئے میں گاڑی کے اسٹیشن پہنچتے ہی پلیٹ فارم سے بھاگا اور جلدی سے آکے بس میں بیٹھ گیا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ سواری کی بس نہ تھی۔ سامان کی بس تھی۔ دوسری بسوں میں مسافر سامان نہیں لے جاسکتے۔ لیکن سامان والی بس میں سامان رکھنے کی اجازت ہے دوسری بسوں میں پینتیس آدمی سوار ہوتے ہیں اس میں صرف اٹھائیس۔ پھر بھی اس میں اٹھائیس سے زیادہ

آدمی ہوں گے ۔ میں نے دل ہی دل میں آدمیوں کو گننا شروع کیا ۔ بتیس آدمی تھے ۔ کیا بس کنڈکٹر بتیس آدمیوں کو لے جائے گا ؟ آخری بس ہے ۔ اکثر بس کنڈکٹر بڑے رحمدل ہوتے ہیں ۔ خصوصاً آخری بس کے موقع پر زیادہ قانون دانی نہیں بگھارتے ۔ چار پانچ آدمی اگر مقررہ تعداد سے زیادہ بھی ہوں تو بٹھا کے لے جاتے ہیں ۔ پھر بھی ممکن ہے جھگڑا ہو ۔ اس لئے میں خوب اچھی طرح سے جم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس اطمینان سے کھڑکی کے باہر دیکھ کر سیٹی بجانے لگا ، جیسے بس میں سب سے پہلے میں ہی سوار ہوا تھا ۔

بس کنڈکٹر نے اندر آ کے مسافروں کو گنا ۔ کہنے لگا ۔ "چار آدمی زیادہ ہیں وہ اُتر جائیں ۔"

" بہت سے آدمی ایک دم بول اُٹھے ۔" جانے دو ۔ بس کنڈکٹر صاحب ۔ آخری بس ہے ۔ بیچارے پیدل کیسے جائیں گے ۔ بس کنڈکٹر صاحب ۔" بس کنڈکٹر نے مسکرا کر گھنٹی بجائی ۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کے پہلے بس کے اندر کی سب بتیاں گُل کیں ۔ پھر انجن کو اسٹارٹ کرنے لگا ۔ تھوڑی دیر تک انجن کے کھانسنے کی آواز آئی ۔ اس کے بعد وہ بھی بند ہو گئی ۔ ڈرائیور نے سوئچ دبا کر اندر کی بتیاں پھر روشن کر دیں ۔ اور اپنی سیٹ سے اُتر کر انجن دیکھنے لگا ۔ مسافروں کے چہروں پر نا امیدی دوڑ گئی ۔ بس کنڈکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا ۔" ابھی پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہو جائے گا ۔

یہ کہہ کر وہ بھی بس سے اُتر کر ڈرائیور کے پاس چلا گیا ۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ۔ میری طرح بہت سے دوسرے مسافر بھی گیارہ بجے والی بس پکڑتے ہیں ۔ اس لئے اکثر جانے پہچانے چہرے نظر آنے لگے ۔ ان میں ڈاکٹر کامتا پرشاد کا چہرہ تھا ۔ گول مٹول ۔ چہرے پر کمزوری ۔ تھوڑی ایک ڈھیلے سوئچ کی طرح لٹک رہی تھی ۔ چہرہ مایوس اور تھکا تھکا سا تھا ۔ میں نے سوچا اس سوئچ کو اوپر نیچے کرنے کے بعد بھی کیا اس چہرے پر کسی طرح روشنی کی برقی رو نہیں دوڑ سکتی ؟ اندر سے میں نے یوں سوچا اور اوپر سے ڈاکٹر صاحب سے یوں کہا ۔

"ڈاکٹر صاحب بڑی دیر سے آ رہے ہیں ۔"

کامتا پرشاد میری طرف دیکھ کے مسکرایا ۔ بولا ۔ "کیا کروں آج کل کمپٹیشن بہت ہو رہا ہے ۔ کاروبار میں مندہ ہے ۔ دوکان پر دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے ۔"

کامتا پرشاد کی دندان سازی کی دوکان فراس روڈ اور چینی گلی کے نکڑ پر تھی۔ چینی گلی میں چاؤین دندان ساز کی دوکان بھی تھی۔ بڈھا چینی تیس سال سے واں جما ہوا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں فراس روڈ پر پیسہ کماتی تھیں اور خود وہ دانت بناتا تھا۔ اس لیے ریٹ کم کرنے کے باوجود بھی کامتا پرشاد آمدنی میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

"میں اپنی لڑکی سے پیشہ کراسکتا ہوں؟" ڈاکٹر کامتا پرشاد نے شکایتاً مجھ سے کہا۔ "اس لئے مجھے دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں بھی چاؤین کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ وہ تو اپنی دوکان ہی میں سوتا ہے۔ اب میں رات بھر اپنی دوکان کیسے کھول سکتا ہوں؟ گیارہ بجے تک دوکان کھولنے کا حکم ہے۔ کھولے رکھتا ہوں۔ اس کے بعد یہ بس بھی مجھے پکڑنا ہوتی ہے۔ اتنی دور رہتا ہوں۔"

میں چپ رہا۔

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "یہ دُنیا کو کیا ہو رہا ہے۔" کامتا پرشاد کی ٹھوڑی کا سوئچ اور بھی نیچے لٹک گیا۔ میرا جی بہت چاہا کہ اس سوئچ کو اُوپر نیچے ہلا کے دیکھوں کہ کہیں پر زندگی کا کنکشن بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔ مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا یہ آخری بس ہے۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔ آخری سٹینڈ سے آگے بھی پندرہ منٹ تک پیدل چلنا ہے۔ اور میں کوئی الیکٹرک کمپنی کا مکینک تو ہوں نہیں کہ ڈھیلے سوئچوں کو دبا دبا کر ٹھیک کرتا رہوں جہنم میں جائے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کے بڑے مایوس لہجے میں کہا۔ "اب تو دن بھر بیٹھے رہو تو گاہک نہیں آتا۔ ہاں رات کو جب فراس روڈ کی گلیوں میں بحری ملاحوں کے ٹولے آنے لگتے ہیں تو اکثر لڑائی دنگا ہو جاتا ہے۔ کسی کا دانت بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بس سمجھیے کہ عین موقع پر لوگ دانت نکلوانے یا بنوانے آجاتے ہیں۔ دوکان کیا ہے فرسٹ ایڈ کا اڈہ ہے اب تو میں نے فراس روڈ کے ایک موالی کو کمیشن دے کر راضی کر لیا ہے۔ کہ وہ ٹوٹے ہوئے دانتوں کے سارے کیس مجھے بھجوا دیا کرے۔ اس پر بھی گزارا نہیں ہوتا۔"

کامتا پرشاد کی بات تین دوکانداروں نے بھی سُنی جو اس کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو سندھی تھے۔ ایک پنجابی تھا۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ تینوں کی دوکانیں ایک

دوسرے کے آس پاس واقع تھیں۔ تینوں کے تینوں رو رہے تھے۔ کاروبار کو کیا ہوگیا ہے۔ صبح سے بوئنی نہیں ہوئی۔ شام کو دو روپے کمائے۔ بس دو روپے، تینوں مگن لعل، مٹھائی والے کے شاکی تھے۔ گاہک کو ادھر آنے ہی نہیں دیتا کمبخت وہیں نکڑ پر سنبھال لیتا ہے۔ ہم منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آخر جب اس کی اچھی مٹھائی ساری بک جاتی ہے۔ تو گاہک کہیں ہماری طرف آتا ہے۔ جی چاہتا ہے سالے کی دوکان کو آگ لگا دوں۔ آج صبح سے کل بارہ آنے کمائے ہیں اب اس میں گھر کیسے چلے گا۔"

اس کے بعد وہ لوگ بٹوارے کی باتیں کرنے لگے۔ گھر جو وہ کراچی میں چھوڑ آئے تھے مکان جو لاہور میں تھا، ہائے وہ دودھ۔ وہ گھی۔ وہ آب و ہوا۔ ہماری گورنمنٹ ریفیوجیوں کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ مگر پاکستان والے، بھائی کچھ بھی کہو ان مسلمانوں میں بڑا ایکا ہے۔"

وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ میں نے نظر گھمائی۔ ایک کھڑکی سے ٹیک لگائے بیکل ایم، اے ایڈیٹر فلم روز بیٹھا تھا۔ اس کا سوکھا بھوکا پتلا چمرخ چہرہ بھنگ کے نشے میں سب کو گھورتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یکایک اس نے فلم روز کی فائل پر ہاتھ مار کے کہا۔ "ہر روز دیر ہو جاتی ہے۔ ہر روز اسی طرح دیر ہو جاتی ہے۔ آٹھ دس گھنٹے فلم روز کے دفتر میں کام کرو۔ جینی صاحب کی گھڑکیاں سنو۔ پھر ڈیڑھ گھنٹہ بوری بندر کے کیو میں بس کا انتظار کرو۔ یہاں پہنچو۔ تو بس خراب ہو جاتی ہے۔ یہ کیا انتظام ہے۔ کیا سلیقہ ہے؟ کیا سوراج ہے؟ بیسٹ کمپنی کو تالا لگا دینا چاہئے۔"

بیسٹ کمپنی کا ایک ورکر بھی بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ رومال میں آم باندھے گھر لے جا رہا تھا۔ وہ غصے میں تاؤ کھا کر بولا۔ "کیا بکتے ہو؟"

بیکل ایم، اے نے فلم روز کی فائل پر ہاتھ مار کے کہا۔ "تالا لگا دو۔ میں کہتا ہوں بیسٹ کمپنی کو تالا لگا دو۔"

"کیوں لگا دو؟" ورکر بولا۔ "اس لئے کہ انجن کبھی کبھار خراب ہو جاتا ہے؟ اس میں کمپنی کا کیا قصور ہے"؟

"کمپنی کا قصور نہیں تو پھر تمھارا ہوگا۔ جب سے تم ورکروں نے یونین بنائی ہے۔ تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں سب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"کیا سمجھتے ہو"؟ ورکر غصے میں بولا۔

"تم لوگ ہڑتال کرتے ہو۔ ڈبل بھتہ مانگتے ہو۔ مہنگائی کا الاؤنس مانگتے ہو۔ کہاں سے وہ روپیہ آتا ہے؟ ہماری جیبوں میں سے جاتا ہے۔ غریب پبلک کی جیب سے جاتا ہے۔ تم مزدور لوگ مزے کرتے ہو۔ مڈل کلاس بھوکی مرتی ہے۔"

بہت سے سفید پوش بابو نما لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ان میں کچھ چہرے میں پہچانتا تھا۔ سیٹھ حاجی داؤد ٹھیکیدار تھے۔ جنھیں جوہو، پر پندرہ بلڈنگیں باندھنے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ ان میں جے بجے شاہ نوبھارت کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ پکچر دیکھنے کے بعد واپس آرہا تھا۔ ایک ملیالی کرسچن جان تھا۔ جو بی۔اے پاس کرنے کے بعد بیکار تھا اور نوکری کی تلاش میں گھومتا رہتا تھا۔ اس کی سیاہ مونچھوں کے نیچے سفید دانت اکثر چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے اکثر اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا تھا۔ کہ وہ غصے میں ہے کہ ہنس رہا ہے۔

"ہاں دیکھونا۔ ہم بی۔اے پاس ہوکے ہم کو نوکری نہیں ملتا ہے۔ دو سال سے نہیں ملتا ہے۔ یہ چار جماعت پڑھ کے سالا مجے کرتا ہے اور سوشلزم سوشلزم پکارتا ہے۔ ہماری طرح بھوکا رہے تو سالے کا سوشلزم نکل جائے اکدم ...."

بیسٹ کمپنی کے ورکر نے آستینیں چڑھالیں۔ لیکن اس کے قریب ریلوے کمپنی کا ایک مزدور بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نیلی مگر میلی کچیلی تیل کی چکنائی سے داغدار وردی کوئلے کے غبار سے اَٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی کوئلے کی کلوئلے کی کلونس تھی۔ جس کے اندر سے اس کی گہری آنکھوں کی روشنی ایک خوفناک سُرخی کی طرح چمک چمک جاتی تھی۔ لوگ اس کے کوئلے کے غبار سے بھرے ہوئے کپڑے دیکھ کے اس سے ذرا دور دور بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریلوے کمپنی کے مزدور نے بس کمپنی کے ورکر کو بازو سے پکڑ کر کہا۔ "کیوں بیکار جھگڑا کرتے ہو۔ ان لوگوں کو ہماری حالت کیا معلوم؟ جانے دو بھئی۔ تھوڑی دیر میں بس چلے گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلے گی پھر اس بابو کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میرا دماغ خراب ہے؟" ملیالی جان غصے میں بولا۔ اس کے دانت ہونٹوں سے باہر نکل آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ابھی وہ قہقہہ مار کے ہنسنے لگے گا۔ ریلوے کمپنی کے

مزدور کو ہنسی آگئی ۔ اس نے مُنھ پھیر لیا۔

جے جے شاہ نے اپنی بیوی سے کہا۔ "بیٹی ڈیوس کی اداکاری تمھیں پسند آئی ؟"

بیوی نے شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ہولے سے مُسکرائی ۔ جیسے بیبیٔ ڈیوس کی اداکاری کو شراب کے گھونٹ کی طرح پی رہی ہو ۔

جے جے شاہ نے اپنی بیوی کے بازو میں چٹکی لے کر گجراتی میں کہا ۔ "تمھاری آنکھیں بھی تو بس بیبیٔ ڈیوس کی طرح ہیں ۔"

بیوی نے بڑی ادا سے اپنی آنکھیں مٹکائیں اور گجراتی میں اپنے خاوند سے کچھ کہا جس کا مطلب غالبًا یہ تھا ۔ " ہٹو پگلے ۔" اس کے بعد بہت سے مسافر اکدم بس کمپنی کی شکایت کرنے لگے ۔

" یہ کیا مذاق ہے ۔ کیا ہم لوگ رات کے بارہ بجے گھر پہنچیں گے ؟ کمپنی کو فوراً دوسری بس کا انتظام کرنا چاہیئے ۔ بلکہ ایک فالتو بس ہمیشہ اڈّے پر کھڑی رکھنی چاہیئے ۔ سالے جنگلی لوگ ہیں ان کو کچھ پتہ ہی نہیں ۔"

ایک مارواڑی بزنس مین سوٹزرلینڈ کی بسوں کا ذکر کرنے لگا ۔ "میں جب سوٹزرلینڈ میں تھا ...."

لیکن اس کی آواز بہت سے لوگوں کے شور و غُل میں ڈوب گئی ۔ اور جب بس کنڈکٹر شور سن کے اندر داخل ہوا تو سب آوازیں ایک بھوکے کُتّے کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں ۔ ہر ایک چہرہ وحشی اور خشونت آمیز نظر آرہا تھا ۔ دن کی تھکن اور گھٹن ، مایوسی ، محنت کی سوگواری اور بے مقصد انتظار ، اضمحلال اور غصّہ اور جھنجھلاہٹ ہر چہرے پر آشکارہ اور شریانیں یوں اُبھر آئی تھیں ۔ جیسے سرِ بازار کوئی حادثہ ہو جائے اور بجلی کی بہت سی تاریں ایک دوسرے سے اُلجھ کر گر پڑیں ۔ ہر شخص اپنی ناکامی کے بخار میں تپ رہا تھا ۔ اور جھنجھلا جھنجھلا کر اپنا غصّہ بس کنڈکٹر پر اُتار رہا تھا ۔

کنڈکٹر بھی اپنی آٹھ گھنٹے کی مسلسل کھڑے رہنے والی ڈیوٹی سے اُکتایا ہوا تھا ۔ آوازیں سُنتے ہی برس پڑا ۔

"تو میں نے کیا جان بُوجھ کے بس روکی ہے ؟ کیا میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتا ہوں ؟ کیا میرے بال بچے نہیں ہیں ؟ کیا مجھے بھوک نہیں لگی ہے ؟ تم لوگ تو ابھی اپنے اپنے گھروں کو پہنچ

جاؤگے ۔ مجھے درسوا سے واپس کولابہ جانا ہوگا ۔ یہاں سے بیس میل دور...... اس کا بھی خیال ہے ۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے ہیں ۔"

" ہانک رہے ہیں ؟ " جے جے شاہ کو اس دو ٹکے کے بس کنڈکٹر پر بہت غصہ آیا ۔ بس میں کھڑا ہو کے چلانے لگا ۔

" ہانک رہے ہیں ؟ " اور تم فرمار ہے ہو ؟ ابھی اپنے الفاظ واپس لو ۔ ورنہ اخبار میں خبر لوں گا ۔ تم جانتے نہیں ہو ، میں کون ہوں ؟ "

" کون ہو ؟ " بس کنڈکٹر نے غصے سے پوچھا ۔ " بمبئی کے گورنر ہو ؟ "

" میں جے جے شاہ ہوں ۔ نو بھارت کا ایڈیٹر ۔ پبلک کا نمائندہ ہوں ۔ تم نے ہماری بے عزتی کی ہے ۔ ہمیں کیا گدھے سمجھا ہے ۔ اُلو ۔ " " شٹ اَپ " کنڈکٹر نے آگے بڑھ کر کہا ۔

" یوشٹ اپ ۔ " جے جے شاہ نے غصے میں تھر تھر کانپتے ہوئے کہا ۔

ریلوے کا مزدور دونوں کے بیچ میں آگیا ۔ اتنے میں گیارہ دس کی گاڑی بھی آگئی ۔ اور جب ان لوگوں نے دیکھا کہ آخری بس ابھی تک اڈے پر کھڑی ہے ، تو وہ لوگ بھی بس کی طرف بھاگے ۔

" آجاؤ ۔ آجاؤ ۔ " جنار کر آم والے نے اپنے ٹوکرے کو سیٹ کے نیچے دباتے ہوئے کہا ۔ بس کنڈکٹر نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی ۔ مگر لوگ اندر آتے ہی چلے گئے ۔ اب بس کے لوگ کنڈکٹر سے بہت ہی خفا تھے ۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح سکڑ کے وہ آنے والے لوگوں کو اندر جگہ دینے کی کوشش کر رہے تھے ۔ تھوڑی دیر میں جہاں بتیس لوگ بیٹھے تھے ، وہاں اب بیالیس آدمی بھرے پڑے تھے ۔

بس کنڈکٹر نے گاڑی سے اُتر کر کہا ۔ " اٹھائیس سے اُوپر میں ایک آدمی نہیں لے جاؤں گا ۔ "

" تمہیں سب آدمی لے جانے ہوں گے ۔ " شاہ چیخ کر بولا ۔

" ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔ " جنار کر آم والا ۔ لپٹن جی بھاجی والا اور بنگال ایم اے نے چلا کر شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی ۔ ریلوے کے مزدور نے جنار کر سے کہا ۔ " یہ کیا دھمالی مچاتے ہو ؟ اٹھائیس آدمیوں کی بس ہے ۔ وہ بتیس لے جا رہا ہے ۔ اب تم دوسرے آدمیوں کو اندر آنے کی دعوت دیتے ہو ۔ بس اتنا بوجھ کیسے لے جا سکتی ہے ۔ عقل کی بات کرو ۔ "

"ہاں ساری عقل تم میں بھری پڑی ہے۔" جنار کرآم والے نے بڑی نفرت سے مزدور کے گندے لباس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور گاڑی سے باہر کھڑی ہوئی ایک گورے رنگ کی سندھی عورت سے کہا۔

"ماں۔ اندر آجاؤ۔ تم بھی اندر آجاؤ۔ یہ بس سب کو لے جائے گی۔"

بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔ بس کنڈکٹر دانت پیس کے رہ گیا۔ بولا۔ "میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کے وہ قریب کے ایرانی ریستوران میں پولیس کو ٹیلی فون کرنے چلا گیا۔

"لانے دو اُسے پولیس کو۔" دربارا سنگھ فلوٹیا جو شراب کے نشے میں دُھت تھا۔ بولا۔ "ہم پولیس سے ڈرتے ہیں؟ بس والوں سے ڈرتے ہیں؟ پوچھ لو کسی سے۔ دربارا سنگھ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس روز ہولی کے دن میں نے ایک مدراسی کے مُنھ پر رنگ مل دیا۔ سالا بولا ہم تم کو مارے گا۔ میں نے ڈانگ مار کے اس کا سر توڑ دیا۔ سالا بھاگ گیا۔ دوسرے دن پھر بس میں ملا۔ سر پر پٹی باندھے تھے۔ میں نے کہا تم مدراسی ہے۔ ہم دربارا سنگھ ہے۔ ہم تمھارا سر توڑ دے گا۔ پولیس کو بُلاؤ سب کے سامنے تمھارا سر توڑ دے گا۔"

دربارا سنگھ کی پگڑی اُتری ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ شراب سے سُرخ تھا۔ اس کے گھٹنوں پر اس کا فلوٹ ایک بکس میں بند پڑا تھا۔

وہ غصے میں جھلا کے بولا۔ "یہ سالا بس کیوں نہیں چلاتا۔"

ایک آدمی نے دربارا سنگھ سے کہا۔ "وہ پولیس کو بُلانے گیا ہے۔"

"بُلا کے لائے۔ پولیس کیا اپنے باپ کو بلا کے لائے۔ دربارا سنگھ سب کا سر توڑ دے گا۔"

بہت سے لوگ دربارا سنگھ کی تعریف کرنے لگے۔ "بڑا جی دار آدمی ہے جی۔ بے خوف، بے جگر، اکیلے دس آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

دربارا سنگھ نے خوش ہو کے کہا۔ "پوچھ لو۔ اس مدراسی سے پوچھ لو۔ بولا تم نے ہم کو مارا۔ میں نے کہا۔ ہاں ہم نے تم کو مارا۔ آج بھی مارا کل بھی مارے گا۔ ہمارا نام دربارا سنگھ فلوٹیا ہے۔ سارا بمبئی ہم سے ڈرتا ہے۔"

جنار کرنے کہا۔" اس بس کنڈکٹر کے بچّے کو تو اب ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یاد ہی کرے گا۔"

تھوڑی دیر میں بس کے بہت سے آدمی ایک ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی بہادری اور بے جگری کی من گھڑت داستانیں سُنا رہا تھا۔ صرف ایک ریلوے کا مزدور چپ بیٹھا تھا۔ لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ میری نگاہیں گورے رنگ کی بُدھی سندھی عورت پر تھیں۔ جو واقعی کسی زمانے میں بڑی خوبصورت ہوگی۔ اس کے قریب ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ یہ دوسری گاڑی سے آیا تھا۔ وہ جوڑا دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کے ایک دوسرے کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں بھی یکایک بس کے سارے منظر کو بھول گیا۔ کیسی خوبصورت تھی۔ دس سال کے بعد بمبئی میں ایسی موہنی مورت دیکھنے کو ملی۔ اسے دیکھ کر میں بس سے اُٹھ کر بہت دور چلا گیا۔ میرے ذہن میں گُلاب کھلتے گئے۔ 'گُلاب جو کبھی تیرے ہونٹ تھے۔ وہ نورس کلیاں جو تیری باتیں تھیں۔ وہ بوسے جو کبھی میرے تھے۔ کیا وہ جھرنا ابھی تک بہہ رہا ہے؟ کیا تو اسی طرح سیب کی ڈالی کی طرح جُھکی ہوئی کھڑی ہے؟ کیا تیرے دل میں میری محبّت کے شگوفے ابھی تک لرز رہے ہیں؟ کیا تیری آنکھوں کے نیلگوں آسمان پر میرے دل کا حیران حیران تارا ابھی تک ڈول رہا ہے؟ ...... کہاں ہے تو؟ اے میری گذری ہوئی محبّت کی پچیس سالہ بازگشت، تو کیوں اس وقت رات کے سناٹے میں ایک دور جانے والی گاڑی کی صدا کی طرح مجھے چونکاتے آئی ہے؟ اپنی یاد کو واپس لے جا کیوں کہ اب میرے لئے کچھ نہیں ہے۔ کوئی گُلاب نہیں ہے۔ کوئی تارا نہیں ہے اور کوئی شگوفہ نہیں ہے۔ میں ہوں، زندگی کا بس اسٹینڈ ہے۔ اور آخری بس کا انتظار ہے ....'

آدمی کو خُدا بھی معاف کر دیتا ہے۔ لیکن محبّت کبھی نہیں معاف کرتی۔

میں نے لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے پر جھکے ہوئے ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ 'نہیں نہیں یہ وہ نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز وہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہیئے۔' میں نے نگاہیں پھیر لیں۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

بس کنڈکٹر ایک پولیس انسپکٹر اور اسٹیشن لائن کے تین سپاہیوں کو لے کر آ رہا تھا۔

یکایک لوگوں کا شور تھم گیا۔ چہرے خوفزدہ ہو گئے۔ جنار کر اور دربارا سنگھ جو سب سے بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ یکایک ایسے چپ ہو گئے جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ جے جے شاہ بار بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کی بیوی گجراتی زبان میں غالباً اُسے تسلی دیتی جاتی تھی۔

پولیس انسپکٹر نے اندر آتے ہی گرج کر کہا۔ "اتنے فالتو آدمی یہاں کیوں بیٹھے ہیں نکالو ان سب کو۔"

سب لوگ چپ رہے۔

"کون کون دیر میں آیا ہے؟" انسپکٹر نے سختی سے پوچھا۔

سب لوگ چپ رہے۔

انسپکٹر نے گھوم کر بس کنڈکٹر سے کہا۔ "تم بتاؤ نا۔ اب میں کس کس کو نکالوں کس کو رکھوں۔"

بس کنڈکٹر نے جے جے شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ آدمی دیر سے آیا تھا۔"

جے جے شاہ نے کانپتے ہوئے غصّے سے کہا۔ "جھوٹ بولتا ہے۔ انسپکٹر صاحب میں تو کب کا اس گاڑی میں بیٹھا ہوں اپنی بیوی کے ساتھ۔ پُوچھ لو اس سے ......" اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر مُسکرایا۔ "بولا۔ تم نیچے آجاؤ۔"

"مگر ......"

"اگر مگر نہیں چلے گی۔"

"مگر میرے ساتھ میری بیوی ہے۔"

بیوی بولی۔ "میں بس میں گھر پہنچ جاؤں گی۔ تم خواہ مخواہ جھگڑا مت کرو۔"

جے جے شاہ نے گھور کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے بولا۔ "میں ۔ میں نوبھارت اخبار کا ایڈیٹر ہوں میں پبلک کا نمائندہ ہوں۔ میں سمجھ لوں گا۔"

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ "میں خود بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر جانے والا

تھا۔ کہ یہ آگیا۔ مجھے مت ستاؤ۔ جلدی جلدی بولو۔ کون دیر سے آیا ہے۔"
کوئی نہیں بولا۔
بس کنڈکٹر نے جنارکر آم والے کی طرف دیکھ کر کہا۔" یہ بھی دیر سے آیا ہے۔"
" ہیں ۔ہیں۔ انسپکٹر صاحب" جنارکر گڑگڑاکر بولا" میں تو بس میں سب سے پہلے گھسا تھا۔ بس اکدم خالی تھا۔ جب میں گھسا......"
"باہر نکلو" انسپکٹر بولا۔
"یہ دربارا سنگھ" بس کنڈکٹر دربارا سنگھ کا نام تک جانتا تھا۔ دربارا سنگھ خاموشی سے اپنی پگڑی اور فلوٹ سنبھال کر اُتر گیا۔ بس کنڈکٹر نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میرا رنگ فق ہوگیا۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح سے مُسکراتا رہا۔ بس کنڈکٹر نے آگے بڑھ کے لیٹن جی بھاجی والے کو اُتار دیا۔
جب وہ کتی لعل دھوبی کو اتارنے لگا۔ تو اسے بہت غصہ آیا۔ کتی لعل دھوبی نے اسے سرزنش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔" آنا کبھی سات بنگلے کی طرف۔ تیری اچھی طرح تکا بوٹی......"
بس کنڈکٹر نے گھبرا کے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھ کے شکایتاً کہا۔" سُن لیجیے حضور سُن لیجیے ابھی سے دھمکیاں دے رہا ہے۔
"کیا کہا؟" پولیس انسپکٹر نے گرج کر پوچھا۔ اس نے کتی لعل کو شانے سے پکڑ لیا اور ایک سپاہی سے کہا۔
" اسے تھانے لے جاؤ اور ڈبل چارج مارو۔"
"نہیں حضور، نہیں حضور، میں تو آپ کا غلام ہوں" کتی لعل گڑگڑانے لگا۔
بس کنڈکٹر پھر مجھے گھورنے لگا۔ میں اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بُلایا۔ جب وہ میری طرف جُھکا تو میں نے بھی اس کی طرف جھک کے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔" وہ جو آدمی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے۔" میں نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کی طرف اشارہ کرکے کہا۔" وہ دوسری گاڑی سے آیا تھا۔"

بس کنڈکٹر نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کے کندھے پر جھپٹا مار کے کہا۔ "باہر نکلو۔"

"مگر میں۔ میں سچ کہتا ہوں میں سب سے پہلے۔ پوچھ لو۔ اس سے۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

اس لڑکی اور لڑکے کو نکالنے کی جرأت بس کنڈکٹر میں بھی نہ تھی۔ وہ کئی بار ان کے پاس سے ہو کر چلا گیا۔ کئی بار وہ ان کے پاس آکر ٹھٹھکا، رُکا، پھر گھبرا کے آگے چلا گیا۔ کئی بار وہ محبت کے ساحل پر آ کے رُکا۔ مگر محبت ایسی والہانہ تھی ایسی اپنے آپ میں کھوئی ہوئی تھی، ایسی اس سے بیگانہ تھی، ایسی اپنی سرمستی میں سرشار تھی۔ دل کے دروازوں کو بند کر کے ایسی بے سُدھ سوئی پڑی تھی۔ کہ اسے دروازے پر کھٹکھٹانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ اور دوسرے دو آدمیوں کو باہر بھیجنے لگا۔ وہ لوگ اللہ اور بھگوان کی گواہی پیش کر رہے تھے۔ مگر بس کنڈکٹر کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ صرف سمندر کا نغمہ سُن سکتا تھا۔

"اب گنو۔" انسپکٹر نے بس کنڈکٹر سے کہا۔

بس کنڈکٹر نے آدمی گنے۔ انتیس حاضر تھے۔ مجھے تو اب وہ کسی طرح نہ نکال سکتا تھا۔ میرے اس کے درمیان میر جعفر کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ بس میں وہی گورے رنگ کی سندھی عورت رہ گئی تھی۔ جو واقعی دیر سے آئی تھی۔ جو واقعی ہمیشہ دیر سے آتی تھی۔ اسے اڈے پر سب جانتے تھے۔ یہ بڑھیا ایک نائٹ اسکول میں ایک غریب اُستانی تھی اور سب سے آخر میں بس اسٹینڈ پر پہنچتی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک بڑا تھیلا ہوتا، جس میں آلو ٹماٹر پیاز اور دوسری سبزی ترکاریاں بھری ہوتیں۔ وہ بیوہ تھی اور ہمیشہ سفید کپڑے پہنتی تھی۔ جن پر اکثر پیوند لگے رہتے تھے۔

بس کنڈکٹر نے بادل نخواستہ اس سے کہا۔ "تم بھی اُتر جاؤ۔"

"پھر میں اس وقت کہاں جاؤں گی؟ کیسے گھر پہنچوں گی"؟

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ میونسپلٹی کا حکم ہے۔"

"مگر بچہ میرے پاس ٹیکسی کے پیسے نہیں ہیں۔ میں تین میل پیدل کیسے جا سکتی ہوں۔ رات کے بارہ بجے۔ بچہ مجھے جانے دو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

وہ پولیس انسپکٹر کے پاؤں چھونے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے جلدی سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں مجبور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بس کنڈکٹر نے شکایت کی ہے۔ میں اٹھائیس سے زیادہ آدمیوں کو اس گاڑی میں سوار نہیں ہونے دوں گا۔ تم نیچے اُتر جاؤ۔"

"بھگوان کے لئے مجھے جانے دو۔ بڑھیا گڑگڑانے لگی۔ میں دس بجے نائٹ اسکول سے فارغ ہوتی ہوں۔ گیارہ بجے یہاں پہنچتی ہوں۔ ابھی گھر جا کے اپنا کھانا بناؤں گی۔ ایک بیوہ پر ترس کھاؤ۔"

بڑھیا رونے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے بس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھ کے کہا۔ "اگر آپ میں سے کوئی آدمی اُتر جائے اور اس عورت کو جانے دے تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

کوئی اپنی سیٹ سے نہیں ہلا۔ نہ حاجی داؤد، نہ میں، نہ بیکل ایم لے، نہ وہ مارہ اڑی جو سوئزرلینڈ سے ہو کے آیا تھا۔ نہ وہ سندھی دوکاندار۔ گاڑی میں سب لوگ بڑے اطمینان سے بیٹھے رہے اور کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے۔ جیسے پولیس انسپکٹر ان سے نہیں خلاء میں کسی سے مخاطب ہو۔

پولیس انسپکٹر نے بڑھیا سے کہا۔ "کوئی نہیں اُٹھا۔ تمھیں نیچے اترنا پڑے گا۔"

بڈھی نے سسکیاں لیتے لیتے اپنے جھولے کو سنبھالا۔ چاروں طرف بس کے بے رحم مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر آہستہ آہستہ بس کے باہر جانے لگی۔

یکایک وہ نیلی وردی والا میلے کچیلے تیل کے دھبوں والا انجن میں کوئلہ جھونکنے والا مزدور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے بڈھی کو روک کے کہا۔ "تم اس سیٹ پر بیٹھو۔ میں اُتر جاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کے اس نے ایک قہر آلود نگاہ سے بس میں بیٹھے ہوئے خوش پوش آدمیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے سیاہ چہرے پر اس کی آنکھیں دو سُرخ بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور خاموشی سے لنگڑاتا ہوا اپنی سونٹی کا سہارا لیتا ہوا نیچے اُتر گیا۔

شاید وہ نیچے نہیں اترا تھا۔ اس نے بہت سے آدمیوں کو ان کی ضمیر کی سیڑھی سے نیچے اتار دیا تھا۔ کیوں کہ جب بس چلی تو ہر شخص اپنی سیٹ پر چُپ چاپ خوفزدہ بیٹھا تھا۔ چیچک رُو گنجن جو بمبے ٹاکیز میں کام کرتا تھا، اس سے یہ خاموشی سہاری نہ گئی۔ اس نے میری طرف جھک کے بڑے رازدارانہ لہجے میں مُسکرا کے کہا۔

"بھائی صاحب۔ آپ بھی تو دیر سے آئے۔"

میں نے گرج کر کہا۔ "میں کہاں دیر سے آیا؟"

گنجن میرے گرجنے پر حیران ہو گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھائی صاحب آپ پہلے آئے تھے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"تم ہمیشہ غلطی کرتے ہو۔" میں نے چلاّ کے کہا۔

گنجن چپ ہو گیا۔ گاڑی میں کوئی نہیں بولا۔

بس موڑ پر سے گذری تو لنگڑاتے ہوئے مزدور کو پیچھے چھوڑ گئی۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے والے لوگوں نے یکایک اپنے چہرے اندر کر لئے۔ لیکن سونٹی کی ٹک ٹک ان کے دلوں کے سخت فرش پر ایک ہتھوڑے کی ضرب کی طرح بجتی گئی۔ اب ہر شخص اپنی جگہ پر شرمندہ، مجوب، ایک بید زدہ کتے کی طرح دُم دبائے چُپ چاپ بیٹھا تھا۔

یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے یہ بس آگے نہیں پیچھے جا رہی ہے اور وہ مزدور ہم سے کہیں بہت دور آگے جا رہا ہے۔

ایک سیتا ایک مگرمچھ

کلدیپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے تقریباً گھسیٹ کے بڑے تار گھر کی طرف لے گیا۔
بڑے تار گھر کے پورچ کے ایک کونے میں آگ جل رہی تھی۔ تین لڑکے آگ پر چربی گرم کر کے اس میں کالکھ گھول کے ایک مرکب تیار کر رہے تھے اور پھر اس مرکب کو پالش کی ڈبیوں میں بند کر رہے تھے۔ میں نے کلدیپ سے پوچھا۔ "کیا چیری بلاسم اور کیوی کا بوٹ پالش ایسے ہی تیار ہوتا ہے؟"
اور کلدیپ نے فوراً جواب دیا۔ "اگر ہم لوگ سچ مچ بازار سے چیری بلاسم اور کیوی کا پالش مہنگے داموں خریدنے لگے تو دھندا ہو چکا۔"
"تو دھندا کیا بے ایمانی اور ملاوٹ کے بغیر نہیں چل سکتا؟" "بوٹ پالش کا کیا۔ کوئی دھندا آج بے ایمانی کے بغیر نہیں چل سکتا۔" کلدیپ کور نے اتنا کہہ کے ایک لڑکے سے، جو اپنے کرتے کی آستین سے پالش کی ڈبیاں چمکا رہا تھا، پوچھا۔ "تامنے کہاں ہے؟

"تامنے تمہارا بھائی؟"

"ہاں"

"وہ افشورنس کمپنی کے مزدوروں کی ٹکڑی میں گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"ادھر ایک آدمی نے اس کو بلایا ہے۔ اس کے پاس ملٹری ڈپو کی پرانی براؤن پالش کی ڈبیاں ہیں۔ وہ سستے میں دے رہا ہے۔ ہم سب لوگ مل کے لے رہے ہیں۔"

یہ لڑکا جس نے یہ اطلاع دی تھی، ناٹے قد کا تھا۔ اس کا منہ چپٹا تھا۔ جیسے کسی نے چپت مار کے کر دیا ہو۔ وہ مجھے بار بار شبہے کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

کلدیپ نے کہا۔ "گھبراو نہیں۔ یہ اپنا دوست ہے۔ اپنا پالش والا ہے۔ مگر ذرا اس کی پالش ہم سے الگ ہے۔"

"جیادہ چمکتی ہے؟" چپٹے مُنہ والا لڑکا میری طرف اور بھی گھور کے بولا۔

"ہاں۔" کلدیپ نے ہنس کر کہا۔

چپٹے مُنھ والے لڑکے نے کہا۔ "جیادہ چمکانے سے کیا فائدہ؟ گاہک چار روز کے بعد آئے گا۔ بس اس وقت چمکا کے ٹھیک ٹھاک کر دو کہ مُنھ بھی دیکھنے لگے۔ باد میں کون پوچھنے آتا ہے کہ کیوی پالش کی ڈبی کے اندر پُرانی ملٹری ڈپو کی ناکارہ بوٹ پالش بھری ہے۔ گاہک کو اس کا ٹائم نہیں ہے۔"

"آہستہ بات کرو۔" پورچ کے دوسرے کونے سے چند لڑکوں نے غصّے سے پکارا۔

کلدیپ نے میری نگاہ ادھر جاتے دیکھ کر کہا۔ "وہ لوگ پتّے کھیل رہے ہیں ان کے کھیل میں ہرج ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ بھی پالش والے ہیں؟"

کلدیپ نے کہا۔ "نہیں وہ لوگ ٹیکسی والے ہیں۔ ادھر چرچ گیٹ کے باہر کھڑے رہتے ہیں یا ایراس سینما کے سامنے یا اسٹوریا ہوٹل کے سامنے۔ جس گراہک کو ٹیکسی کی ضرورت ہوتی ہے، اسے اڈّے سے یا بھاگتی ہوئی ٹیکسی کو کھڑا کر کے لا کے دیتے ہیں۔ اس بڑے تار گھر پر ان کا اڈّہ ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمھارا بھائی تمھارے ساتھ کیوں نہیں رہتا؟"

کلدیپ نے کہا۔ "میرا بھائی پالش مارنے کا کام نہیں کرتا۔ پالش بیچنے کا کام کرتا ہے۔ پالش بناتا ہے اور لڑکوں کو بیچتا ہے۔ اِدھر اُدھر سے پُرانے ملٹری ڈپو کے پُرانے جنگی سامان سے سستے داموں پالش لے کے آتا ہے۔ پھر بازار سے پُرانی کیوی پالش کی ڈبیاں خریدتا ہے اور اس میں پالش بھر کے بیچتا ہے۔ یہ چار لڑکے ہیں جو یہ کام کرتے ہیں اِدھر ہی رہتے

ہیں، اسی کونے میں آگ جلاتے ہیں۔ صبح کو ہنڈیا برتن اٹھا کر چوکیدار کے کمرے میں رکھ دیتے ہیں۔
کلدیپ مجھے اپنے ساتھ لے کر پورچ کے دوسرے کونے میں چلا گیا جہاں ٹیکسی لانے والے تاش کھیل رہے تھے۔
"ہے جوگلیکر"، کلدیپ کور نے ایک لڑکے کو آنکھ مار کے کہا، جس کی عمر کوئی بیس برس کے قریب ہوگی۔
جوگلیکر نے آنکھ کے جواب میں آنکھ مار کے کہا۔ "کائے"؟
کُلدیپ کور بولا۔ "تیرے مگرمچھ کا کیا حال ہے؟"

مگرمچھ، جیسا گفتگو کے دوران میں پتہ چلا، کوئی دریائی جانور نہیں تھا۔ خشکی پر چلنے والی ایک لڑکی تھی، جو ہمیشہ پانچ بجے کی گاڑی سے چرچ گیٹ کے اسٹیشن پر اُترتی تھی۔ اس کا لباس طرح طرح کا ہوتا تھا۔ کبھی ساڑی، کبھی غرارہ، کبھی فراک، کبھی سایہ، کبھی پاجامہ، لیکن بٹوا ایک ہی ہاتھ میں ہوتا تھا۔ بٹوا مگرمچھ کی کھال کا تھا۔ لباس میں تبدیلی ہوسکتی تھی۔ لیکن بٹوے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہاتھ میں اسی بٹوے کو لئے اسٹیشن پر اترتی تھی۔ اس لئے ٹیکسی لانے والوں نے اپنی گفتگو میں اس کا نام مگرمچھ رکھ دیا تھا۔ مگرمچھ اسٹیشن پر اُتر کر جوگلیکر سے اور اگر جوگلیکر نہ ہوا تو کسی دوسرے ٹیکسی لانے والے سے ٹیکسی لانے کو کہتی۔ لیکن سب ٹیکسی لانے والوں کو معلوم تھا کہ وہ ٹیکسی نہیں چاہتی ہے، ایک گاہک چاہتی ہے۔ یہ ٹیکسی لانے کا بہانہ پولیس سے بچنے کا بہانہ تھا۔ پھر اس کے بعد ٹیکسی لانے کا آرڈر دے کے وہ مگرمچھ عورت بڑے اطمینان سے چرچ گیٹ اسٹیشن کے باہر فٹ پاتھ پر بظاہر ٹیکسی کے انتظار میں ٹہلتی رہتی۔ حتیٰ کہ اس کا کوئی گاہک آجاتا۔ یا کوئی اس کے لئے ٹیکسی روک لیتا۔
مگرمچھ بڑی طرح دار عورت تھی، اور اس کی نگاہوں کا لہجہ بڑا صاف تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے گاہک کو حاصل کرنے کے بعد جوگلیکر کو آٹھ آنے پیسے دیتی حالاں کہ دوسرے گاہک صرف دو آنے کے پیسے دیتے۔ بڑی ٹیکسی کے لئے دو آنے چھوٹی ٹیکسی کے لئے ایک آنہ۔
میں نے گفتگو کے دوران میں پوچھ لیا۔ "اگر کوئی بڑی ٹیکسی کے لئے ایک آنہ دے تو؟"

جوگلیکر بولا۔ "اس وقت تو ہم کچھ نہیں بولتے۔ لیکن اس کی شکل یاد رکھتے ہیں۔ پھر دوسری مرتبہ جب وہ ہم سے ٹیکسی لانے کے لئے کہتا ہے تو سب لڑکے ایکا کر لیتے ہیں۔ بول دیتے ہیں کہ یہ پھوکٹ آدمی ہے۔ بس اس پھوکٹ آدمی کو ہمارے اڈے پر کبھی ٹیکسی نہیں ملے گی، جو ہمارا ریٹ نہیں دے گا۔ وہ کبھی ہمارے اڈے سے ٹیکسی نہیں لے جاسکتا۔"

"ایسا؟"

"ہاں ایسا۔ سالا بمبئی میں ایسا ایسا پھوکٹ آدمی پڑا ہے کہ ایک دفعہ ہم کو ایک آدمی نے وہ پیسہ دیا۔ میں نے اس کے منہ پر مارا۔ سالا آج کل تو دو پیسہ بھیک مانگنے والا بھی نہیں لیتا۔ ہم کیا بھکاری ہے؟"

"ابے سالے نہیں۔ جوگلیکر تُو تو ٹیکسی لانے والوں کا بادشاہ ہے۔ بول وہ تیری مگر مچھ کہاں ہے؟ دو چار دس دن سے اس کو چرچ گیٹ اسٹیشن پر نہیں دیکھا۔ سالے ہم بھی نمبر رکھتے ہیں۔"

جوگلیکر نے بتایا کہ مگر مچھ کو پولیس نے دھر لیا ہے کیوں کہ وہ اپنا جسم بیچتی تھی، اس لئے کہ وہ فاحشہ تھی۔ اس لئے پولیس نے اس کو دھر لیا ہے۔ کتنے دن حوالات میں رہی۔ کسی نے اس کی ضمانت نہیں دی۔ وہ سب گراہک، وہ سب سیٹھ مارواڑی، بوہرے، کچھی۔ جو اس کو پکڑ پکڑ کے لے جاتے تھے۔ اس مصیبت کے وقت کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا —— ہاں سالے اس کے جسم سے فائدہ اٹھا کر اپنا وقت ہرا کر کے کھسک گئے۔ آں۔ سب کھسک گئے۔ میں مقدمے میں گیا تھا۔ بولتی تھی جوگلیکر تم ضمانت دو۔ ہم غریب آدمی کدھر سے ضمانت دے گا۔ اب جیل میں ہے۔ آں میں اس سے ملنے گیا تھا — اِدھر آرتھر روڈ کے بندی خانے میں ہے۔ میں نے بولا میں اس کا بھائی ہوں۔ اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ تو سالوں نے ملنے دیا۔ مگر بڑی اچھی عورت تھی۔ وہ کیسا دھندا کرتی تھی، ہم کو تو آٹھ آنہ روج دیتی تھی۔ آج کل کون بڑا دھندا نہیں کرتا ہے؟ ہم نے بڑا بڑا سیٹھ دیکھا ہے —— شراب کی باٹلی کو ٹیکسی میں رکھ کے لے جاتا ہے۔ گوا سے اسے اٹھارہ روپے میں لاتا ہے اور ادھر اُسے ساٹھ روپے میں بیچتا ہے۔ ہم کو ٹیکسی لانے کا وہی دو آنہ دیتا ہے۔ کیا دل ہے اس عورت کا۔ آٹھ آنے ہم کو دیتی تھی۔ ہم جب

بندی خانے میں اس سے ملا تو وہ بہت روتی تھی۔ مجھ کو اس نے یاسین سیٹھ کا پتہ دیا۔ بولی اس کے پاس جاؤ۔ وہ میری اپیل ضرور کرے گا۔ ہم گیا۔ سالا ملیبار ہل پر رہتا ہے۔ یہ بڑی کوٹھی ہے۔ سالا کسی نے پہلے تو اندر ہی گھسنے نہ دیا۔ جب کسی نہ کسی طرح اندر گھس گیا تو کوئی سیٹھ سے ملنے نہیں دیوے۔ بولے ہم کو بتاؤ کیا کام ہے۔ میں بولوں۔ میں تم کو کیوں بتاؤں مجھ کو سیٹھ سے پرائیویٹ کام ہے۔ آخر سیٹھ ہم کو ملا۔ جب ہم نے اس کو مگر مچھ کا پیغام دیا۔ تو سالا مارنے کو دوڑا۔ اس کا سیکرٹری مارنے کو دوڑا۔ اس کا نوکر مارنے کو دوڑا۔ ارے بڑا گھوٹالا ہوا۔ بہت مارا سالوں نے ......"

"ارے یار تو بھی اِدھر آکے اس وقت ہمارا مجا کھراب کرتا ہے۔ چل بے پتّہ چل۔ یہ اینٹ کا یکہ ہے۔"

جو گلیکرا اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھر تاش کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ ہم لوگ وہاں سے چل دیئے کیوں کہ گلدیپ کا بھائی وہاں نہ ملا تھا۔ اب اس کی تلاش میں کلدیپ کور فلورا فاؤنٹین کے مغرب میں جو نئی انشورنس کمپنی کی بلڈنگ بن رہی تھی، وہاں جانا تھا۔ کلدیپ کور سے رستے میں میں نے پوچھا۔ "یہ ٹیکسی لانے والے بھلا دن میں کیا کما لیتے ہوں گے؟"

"یہی کوئی آٹھ آنے۔"

"بس؟"

"ہاں۔ مگر یہ کوئی صرف ٹیکسی لانے کا دھندا تھوڑی کرتے ہیں۔ صبح کو یہ اخبار بیچتے ہیں ساڑھے نو سے دس تک۔ پھر جب چرچ گیٹ پر پسنجروں کا زور پڑتا ہے اور دفتروں کو جانے والے بابو لوگ دھڑا دھڑ آتے ہیں۔ تو دس سے گیارہ تک یہ لوگ ٹیکسی لانے کا کام کرتے ہیں۔ دوپہر ان کی خالی ہوتی ہے۔ پھر تیسرے پہر سے رات کے نو بجے تک ٹیکسی لانے کا کام کرتے ہیں۔"

"اور نو بجے کے بعد؟"

"نو بجے کے بعد یہ لوگ جیادہ سے جیادہ جوا کھیلتے ہیں اور جو لڑکے جیادہ ہوشیار ہوتے ہیں وہ عورتوں کی دلالی بھی کرتے ہیں۔ اتنے کام کرنے کے بعد جا کے کہیں ان کو روز کے ڈیڑھ دو روپے وصول ہوتے ہیں۔ اس میں بہت کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے تم یہ سب کچھ اپنی کتاب میں لکھو گے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہاں سالے بدبے خلطیف۔"

کلدیپ کور نے اس زور کا ہاتھ میری پیٹھ پر مارا کہ میں گرتے گرتے بچا۔ اور ایک سنتری سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ وہ تو اچھا ہوا سنتری کلدیپ کا واقف تھا۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔ کلدیپ نے فوراً سنتری کو سلام کیا۔

سنتری نے مُسکرا کر کہا۔ "سالے آدھی رات کو دارو پی کے دنگا کرتا ہے۔ حوالات میں ٹھونک دوں گا۔"

کلدیپ نے سنتری کو ایک اور سلام کیا۔ بولا "ستار بھائی غریب آدمی کو روٹی نہیں ملتی، دارو کدھر سے پیئے گا۔ تم کہیں سے پلا دو نا۔ بھگوان کی قسم بڑی مدت سے نہیں پی" کلدیپ یہ کہہ کے اپنی زبان اپنے سوکھے ہونٹوں پر پھیرنے لگا۔

سنتری نے ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ مگر کلدیپ ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ سنتری اسے گالی دے رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔

آگے جا کے کلدیپ کور نے مجھ سے کہا۔ "ستار بھائی کی ڈیوٹی پہلے ہمارے چال پر تھی۔ جب سے میں اس کو جانتا ہوں۔ مگر کب سے اس بے چارے کی ترقی نہیں ہوئی۔ کتنے سالوں سے اس کو دیکھ رہا ہوں۔ وہی سنتری کا سنتری ہے۔ دوسرے لوگ حوالدار ہو گئے انسپکٹر ہو گئے۔ اب ہم سے بات نہیں کرتے مگر ستار بھائی بہت اچھا آدمی ہے۔ مسلمان ہے۔ مگر بڑا اچھا آدمی ہے۔"

سامنے نیشنل مرکنٹائل انشورنس کمپنی کی عمارت بن رہی تھی۔ آٹھ منزلہ بلڈنگ بلند و بالا اپنی نامکمل حالت میں بھی بڑی عالیشان معلوم ہوتی۔ عالیسان نیویارک کے اعتبار سے نہیں بمبئی کے اعتبار سے۔ بلڈنگ کے نیچے فٹ پاتھ پر اور رستے کے کنارے کنارے لوہے کی سلاخیں، لکڑی کے تختے، سیمنٹ روڑی اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک طرف آہنی چکر اپنا ڈھول سا پیٹ نکالے کھڑا تھا۔ عمارت کے چاروں طرف بانس کے لانبے لانبے ڈانڈ بندھے ہوئے نیچے سے اوپر تک چلے گئے تھے۔ زمین پر سُرخ پتھروں اور سنگِ مرمر کی سلوں سے ٹیک لگائے عمارت بنانے والے مزدوروں کی ٹولیاں اپنے بیوی بچوں سمیت سو رہی تھیں۔ صرف ایک کونے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اور یہاں چند مزدور ڈھولک لئے آلھا

گار ہے تھے۔

ویر پڑے ہیں ویروں کے اور راجپوتوں کی تلوار

گرجا لکھے جب للکارا اور آلہ سے کہا سُنائے

بیاہ کے دن اب نزدیک آگئے اب تم سُنو کان گائے

کرو تیاری اب چلنے کی انتظام سب سیو کرائے

فوج سجالو اب جلدی سے نینا گڑھ کا دھیان لگائے

کیسے تم آرام سے بیٹھے کیسا تم کو چین سہائے

لوٹ کر جواب دیا آلہ نے میرے ویر ملکھان

حکم سُناؤ سرداروں کو سب چلنے کا کریں سامان

یہ من مان گئی ملکھے کے ہردیہ میں گئی سمائے

توپ دروغہ کو بُلوایا۔ ملکھے نے دیا حکم سُنائے

جتنی توپیں ہیں صوبے میں سب چوکھن پر لو چڑھائے

ہاتھی دروغہ کو بُلوایا۔ اپنے پاس لیا بٹھلائے

گرجا ملکھا جب للکارا بھیا سُن لو کان لگائے

جتنا ہاتھی ہے صوبے میں سب پر ہودا دو کسوائے

سانولے رنگ کا ایک مزدور اپنی آنکھیں سُرخ کئے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر آواز کو زور سے کھینچتا ہوا گا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد دوسرے مزدور دھیمے دھیمے سروں میں گنگنا رہے تھے یا سر ہلا رہے تھے۔ جہاں پر کسی کو اگلا شعر یاد ہوتا وہیں پر سے "ہوں" کر کے اُونچی آواز میں اپنی آواز سے سانولے رنگ کے مزدور کی مدد کرتا۔ " ہاں ___ جب گرجا ملکھا جب للکارا" کا آدھا مصرعہ بار بار آتا تو سب مزدور اس کی دہائی دیتے اور گرج گرج کر گانے لگتے۔

گرجا ملکھا جب للکارا بھیا سن لو کان لگائے

ہمیں اپنے قریب آتے دیکھ کے وہ ہماری طرف دیکھتے گئے اور گاتے گئے۔ لیکن جب ہم بالکل ان کے سر پر پہنچ گئے تو وہ چُپ ہو گئے۔

کلدیپ نے گانے والے نوجوان سے پوچھا۔ "تامنے اِدھر آیا تھا؟"

"ہاں آیا تھا۔"

"پھر؟"

سانولے رنگ کا نوجوان میری طرف دیکھ کے چُپ رہا۔ کُلدیپ کور نے کہا۔ "کہو کہو یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

اس کا شاید سودا ہو گیا ہے۔ ابھی وہ فوجی ٹھیکدار اِدھر آیا تھا۔ تامنے اس کے ساتھ گیا ہے۔"

کلدیپ سنگ مرمر کی سِل پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بولا "اتنی رات گئے تم ابھی تک آلھا گا رہے ہو۔ لوگوں کو سونے نہیں دیتے۔ تمھیں کوئی کچھ کہتا نہیں پانڈے؟"

پانڈے جواب میں آہستہ سے مسکرایا۔ بولا آج جوشی کا بیاہ ہوتا۔ اس لئے ہم آج آلھا کے بیاہ کا قصہ گا رہے ہیں۔ وہ آج زندہ ہوتا تو بھی یہ قصہ گانا ہی پڑتا۔ اپنا ساتھی تھا۔ ایک ایک بند میں اس کی یاد آتی ہے اور ایسے دل کو کاٹتی ہے جیسے سُرخ پتھر کو سانی کاٹتی ہے۔

یکایک ایک نسوانی آواز اندھیرے میں سے آئی "بند کیوں کر دیا پانڈے۔ گاؤ۔"

پرے پتھروں کے ڈھیر سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس لئے نظر نہیں آتا تھا۔ صرف اس کے ہاتھ نظر آتے تھے جو اس نے اپنے گھٹنوں کے آگے باندھ رکھے تھے۔ اور پاؤں نظر آتے تھے جو سُرخ گھاگرے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

میں نے پانڈے کی طرف استفسار کی نگاہوں سے دیکھا۔

پانڈے نے بہت آہستہ سے کہا تاکہ وہ لڑکی نہ سُن لے۔ "یہ سبنتا ہے رام جوشی کی منگیتر۔ آج کے روز ان دونوں کی شادی ہوتی اگر وہ سالا شرابی سیٹھ اپنی گاڑی کو ہمارے فٹ پاتھ پر نہ چڑھا دیتا۔"

کلدیپ نے کہا۔ "ان کے آٹھ ساتھی مارے گئے جن میں رام جوشی بھی تھا۔ جس کی آج شادی تھی۔"

بڈھا وسنت ساٹھے جس کے سر پر بال سارے سفید ہو چکے تھے اور جس کے بڑے بڑے ہاتھ سوکھی چھڑیوں کی طرح مڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے، مجھ سے کہنے لگا۔ "رام مجھ کو بچوں کی طرح عزیز تھا۔ میں نے ان ہاتھوں سے اسے پتھروں کی کاریگری سکھائی تھی۔ پتھر سے پتھر جوڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پتھر پر پالش کرنا کہ آدمی کو اس میں اپنا چہرہ نظر آسکے، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پتھر کا جگر کاٹ کے اس میں انسان کی صورت بنانا، اس میں ہرے بھرے کھیت رکھانا، اپنے کلیجے کا لہو دینے کے برابر ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اس بمبئی کی خوبصورت عمارتوں کو دیکھتے ہیں۔ باہر عمارت کے مالک کا نام پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں واہ سیٹھ مدورکا نے کتنی خوبصورت عمارت بنائی ہے۔ اور چلتے چلتے ایک لمحے کے لئے بھی غور نہیں کرتے کہ یہ خوبصورتی کس نے بنائی ہے۔"

پانڈے نے لالٹین اٹھا کے کلدیپ سے کہا۔ "ذرا یہاں سے اُٹھ میں تجھے ایک چیز دکھاتا ہوں۔"

کلدیپ جس پتھر سے اُٹھا، وہاں اس کے قریب پانڈے نے اپنی لالٹین لے جا کے ہمیں دکھایا۔ یہ ایک سیاہ سنگِ مرمر کی سل تھی۔ جس پر ایک مزدور ایک بڑے گودام کے سامنے ہاتھ اُونچے کئے کھڑا تھا۔ اس مزدور کا چہرہ نہیں تھا اور اپنے ہاتھوں میں وہ کچھ لئے کھڑا تھا۔ وہ ایک گولا سا تھا۔ لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ کاریگر نے کام کرتے کرتے اس تصویر کو چھوڑ دیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "رام جوشی اس سل پر کام کر رہا تھا؟" "ہاں۔ اور جانتے ہو وہ ان ہاتھوں میں کیا اُٹھائے ہوئے ہے۔ یہ مزدور جس کا چہرہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"رام جوشی ان ہاتھوں میں دُنیا کا گلوب بنا رہا تھا۔ مزدور اپنے محنتی ہاتھوں سے ساری دُنیا کا بوجھ اُٹھائے ہے۔" تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد پانڈے نے۔ "اب اس مورت کو میں مکمل کر رہا ہوں۔"

بڈھا وسنت ساٹھے بولا۔ "کیونکہ ہماری تصویر ادھوری نہیں رہ سکتی۔"

میں نے پوچھا۔ "رام جوشی اس حادثے میں مارا گیا۔ لیکن تم نے کوئی واویلا نہیں کیا۔"
بڈھا وسنت ساٹھے میری عقل پر ہنسا۔ کلدیپ نے میرے شانے پر ہاتھ مار کے کہا۔ "تو بھی سالے کچھ نہیں جانتا۔ ارے یہ بلڈنگ دس روز سے بند پڑی ہے۔ یہاں کام نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کہتے ہیں ہمارے آٹھ ساتھیوں کا ہرجانہ دو۔ ہمارے فٹ پاتھ پر مرجانے کی بجائے ہمارے لیے کہیں سونے کا انتظام کرو۔
پانڈے نے کہا۔ "ہم لوگ شہر کی ساری عمارتیں بناتے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔"
بڈھا وسنت ساٹھے بولا۔ "میں بتیس برس سے اسی کام کو کر رہا ہوں۔ میرین ڈرائیو پر سیٹھ مدراکا کی جو دو بڑی بلڈنگیں ہیں نا۔ ان پر میں نے کام کیا ہے۔ اور کہاں کہاں کام نہیں کیا ہے فورٹ سے لے کر سانتا کروز تک سینکڑوں بلڈنگیں اپنے ہاتھ سے کھڑی ہیں۔ ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر لے کر انھیں زمین سے آسمان تک پہنچایا ہے۔ لیکن مجھے آج تک کھولی میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ ایک روز اسی فٹ پاتھ پر مرجاؤں گا۔ اسی طرح کسی شرابی سیٹھ کی گاڑی آئے گی اور شراب بندی کے بعد بھی وہ اس فٹ پاتھ پر چڑھ جائے گی اور میری گردن کچل جائے گی۔ کیوں بے مہتہ جھوٹ کہتا ہوں؟"
مہتہ ڈھولک بجانے والا تھا۔ جب اس نے یہ بحث چھڑی دیکھی تو اس نے اپنی ڈھولک کندھے سے اُتار کر نیچے رکھدی اور اس کی تنیاں کستے ہوئے بولا۔ "یہ ٹاؤن ہال ہم نے بنایا ہے۔ یہ تاج محل ہوٹل ہم نے بنایا ہے۔ وزیر اعظم کا گھر ہم نے بنایا ہے۔ ٹاٹا ایرویز کا دفتر ہم نے بنایا ہے۔ لیکن ہمارے لئے کوئی ہوائی جہاز نہیں۔ کوئی ہوٹل نہیں۔ کوئی کوٹھی نہیں۔ اس بمبئی کے چپے چپے پر میری کُدال اور ہتھوڑے کے نشان ہیں۔ لیکن میں اس نشان کو اپنے کندھے پر اُٹھا کے چلتا ہوں تو لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ اور مجھے خطرناک کہتے ہیں۔ اگر اپنے رہنے کے لئے گھر مانگنا جُرم ہے تو واقعی میں مجرم ہوں۔"
یہ کہہ کر مہتہ نے اتنے زور سے ڈھولک کی ایک تنی کسی کہ وہ بیچ میں سے ٹوٹ گئی۔ اور ڈھولک کی کھال میں سے زور کی گونج پیدا ہوئی۔ ساٹھے نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "آہستہ سے"

ڈھولک پر اپنا غصہ نہ اتارو۔"

پانڈے نے کہا۔ "آج دس روز سے ہم لوگ ہڑتال پر ہیں۔ سُنا ہے آج سے آٹھ روز کے بعد گورنر صاحب اس بلڈنگ کو کھولنے والے تھے۔ لیکن اب یہ بلڈنگ نہیں کھلے گی اسے ہمارے سوا اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ وہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بڑے سے بڑے نیتا کو اور اس سے یہ عمارت مکمّل کرا لیں۔ ہم بھی دیکھیں گے۔ یہ لوگ پتّھر ڈھونا نہیں جانتے خالی سونے کی قینچی سے ریشم کا ایک فیتہ کاٹنا جانتے ہیں۔"

درد میں ڈوبی ہوئی کانپتی ہوئی نسوانی آواز پھر سنائی دی۔ "پانڈے آلھا کیوں بند کر دیا۔ گاؤ۔"

پانڈے نے اندھیرے میں بیٹھی ہوئی سیتا کی طرف دیکھ کے سرگوشی میں کہا۔ "عجیب لڑکی ہے۔ جب سے رام جوشی مرا ہے اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں گرا۔ چُپ چاپ اپنا کام کئے جاتی ہے۔ دن بھر گھوم کے مزدوروں کے لئے محلوں سے روپیہ پیسہ چندہ جمع کر کے لاتی ہے اور سب کو برابر بانٹ دیتی ہے۔ کسی نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی نے اسے روتے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسی روز دھولیا کا بچہ بیمار ہو گیا۔ دو دن جاگ کر اس نے اس کی خدمت کی۔ خود اپنے حصّے کے چندے کا کھانا نہیں کھایا۔ بچّے کے لئے دودھ لے آئی۔"

"آلھا گاؤ۔" سیتا وہاں سے چلائی۔ اس کی آواز میں بڑی تڑپ تھی۔ ایک عجیب سی پکار۔

مہتہ نے ڈھولک اپنے کندھے پر سنبھال لی۔ پانڈے نے کان پر ہاتھ رکھ کے گانا شروع کیا۔

.....آلھا کا بیاہ .....

ایک برنی کے دو بیر ناہیں کون کے سنگ مچلائے جائے

وہاں سے موڑ کے پھر ملکھے نے چھدا کو دیا موڑ گھمائے

آلھا کو للکارا بھیّا سُنو پتا پھل لائے

بیٹھ جاؤ تم پٹڑے پر نائی تھیں بانا دیو پنائے

اتنی سن کے ملکھے کی۔ آلھا گیا چوکے میں آئے

چھدا نائی نے سب بانا نوشے کا دیا پہنائے

آلھا بیٹھا پٹڑے پر ـــــ آلھا نوشہ دیا جلائے

آلھا بیٹھا پٹڑے پر ـــــ آلھا نوشہ دیا جلائے

آلھا بیٹھا پٹڑے ....

یکایک سیتا پتھروں کے ڈھیر پر سے اُٹھی اور دوڑتی ہوئی آئی اور سب لوگوں کے بیچ میں آ کے اس سنگِ مرمر کی سِل سے لپٹ گئی، جہاں رام جوشی کا مزدور اپنے دونوں ہاتھوں میں دُنیا اُٹھائے کھڑا تھا۔ اس وقت بھی وہ روئی نہیں۔ ایک آواز تک اس کے مُنہ سے نہیں نکلی۔ اس کی انگلیاں اتنی سختی سے اس مورت پر جم گئیں جیسے وہ اس مورت کا ایک حصّہ ہوں۔ جیسے اس کی ہتھیلی کا ہر نقش اور پور کی ہر رگ اسی سخت سنگ مرمر سے اُبھری تھی۔ بڈھا وسنت اپنے بھری ہوئی نیلی دریدوں والے ہاتھ اس کے جھکے ہوئے سر پر پھیرنے لگا۔ وہ بھی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ بالکل چپ تھا۔

وسنت ساٹھے بالکل چپ تھا۔ لیکن اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ چپ تھا لیکن اس کے کانپتے ہوئے ہونٹ گویا اس لڑکی سے کہہ رہے تھے۔ "نہیں نہیں سیتا تو آج نہیں روئے گی۔ کئی ہزار سال ہوئے جب رام نے ظالموں کے کہنے میں آ کے تجھے بن باس دے دیا تھا۔ لیکن آج تجھے بن باس نہیں لینا ہے۔ آج تجھے بن باس دینا ہے۔ ظالموں کو بن باس دینا ہے۔ انھیں اجودھیا نگری سے بالکل باہر نکال دینا ہے۔ اس لئے آج تو نہیں روئے گی۔ آج تیری آنکھ کا ایک آنسو بھی بے کار نہیں جائے گا۔

وہی جگہ

اشوک ڈھاکے بمبئی اسٹاک ایکسچینج پر دلالی کا کام کرتا تھا۔ ابھی کوئی دو سال کی بات ہے وہ بمبئی کے مضافات میں نواسری کے مقام پر ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک کمرے میں اپنے بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اسٹاک ایکسچینج پر گھس گھس کے اس کی چالاکی میں بلیڈ کی سی دھار پیدا ہو گئی تھی۔ اسٹاک ایکسچینج پر ہیر پھیر کرنے میں اور موقع ملنے پر اپنے محسن ہی کا گلا کاٹ ڈالنے میں اسے کوئی عار نہ تھا۔ بزنس بزنس ہے۔ یوں وہ بڑا مذہبی آدمی تھا۔ دھرم کرم کا پکا۔ صبح اٹھتے ہی وہ نواسری کے مندر میں جاتا جو نواسری اور بڑگام کے درمیان ایک سنسان اکیلی سڑک پر واقع تھا — اور گنیش جی کی مورتی کو پرنام کر کے ہی اسٹاک ایکسچینج پر جاتا۔ اسٹاک ایکسچینج پر جانے سے پہلے وہ آج کے بھاؤ کے متعلق اخبار دیکھنے کے علاوہ، نواسری کے جوتشی پنڈت ہری بلبھ سے بھی مشورہ کرتا۔ یہ سچ ہے کہ پنڈت ہری بلبھ سے روز مشورہ کرنے کے بعد بھی اس کی غربت بدستور قائم تھی اور وہ ابھی تک سیاہ کھولی میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے جوتش پر بڑا اعتقاد تھا۔ اور صرف اسے ہی کیا اعتقاد تھا۔ اس کے ساتھی اور ہمراز اور بڑے بڑے سیٹھ جو دس دس ٹیلیفون لگائے اسٹاک ایکسچینج پر بیوپار کرتے تھے، ان سب کو جوتش بدیا پر بڑا بھروسہ تھا۔ جونہی شہر میں کوئی نیا پنڈت آ ابرا جتا، یہ لوگ کتے کی طرح سونگھتے ہوئے اس کے استھان پر پہنچ جاتے۔ آج کل بمبئی میں جتنے پنڈت آتے ہیں۔ بمبئی اسٹاک

ایکسچینج کا جوتش سیکھ کر آتے ہیں۔ سُنتے ہیں بنارس میں ایک نئی یونیورسٹی کھلنے والی ہے جو صرف جوتش ودیا اور اس میں بھی صرف اسٹاک ایکسچینج کے بھاؤ پر خاص طور پر دھیان دے گی۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے کیوں کہ دوسرے ملکوں میں لوگ تو اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح کروڑوں روپے خرچ کر کے چاند میں اُڑ کے جائیں تا کہ چاند کی قسمت کا حال معلوم کر سکیں، یہاں ہم گھر بیٹھے ہی کاغذ کے ایک پُرزے پر کنڈلی بنا کر چاند کی قسمت کا سارا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے ....۔

اشوک ڈھا کے مندر سے واپس لوٹتے ہوئے، پنڈت ہری بلبھ کے گھر جاتے ہوئے، اس سنسان سڑک کی طرف دیکھتا جو نواسری سے بڑگام کو جاتی ہے۔ جس کے دونوں طرف نشیبی زمین ویران اور بنجر پڑی ہے اور لانبی لانبی گھاس اور جنگلی جھاڑیوں سے بھری ہوئی دور حدِ نظر تک خالی پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بڑگام نواسری سے صرف تین میل دُور تھا اور سمندر کے کنارے کنارے آباد تھا۔ یہاں بڑے بڑے سیٹھوں کی کوٹھیاں تھیں اور ہوٹل تھے اور ہر سنیچر اور اتوار کو بمبئی کے لوگ دُور دُور سے چل کے اس پُر فضا مقام پر، اس کے ناریل کے جھنڈوں میں پکنک منانے آتے تھے۔ اس کے علاوہ لوکل آبادی بھی کئی ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک تو بڑگام کے امیر مچھیرے تھے جن کی آبادی پانچ چھ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ پھر سندھ اور پنجاب سے آئے ہوئے مہاجر تھے۔ بڑگام میں سرکار نے ان مہاجروں کے لئے ایک کیمپ بھی کھول رکھا تھا۔ اس میں بھی تین ہزار سے کم آبادی نہ ہوگی۔ اس لئے بڑگام میں بڑی چہل پہل تھی اور یہ مقام دن بدن ترقی کرتا جا رہا تھا۔ اور اس ترقی کا اندازہ اشوک ڈھا کے لوگوں کے چہروں سے یا ان کے بچوں کے کپڑوں سے نہیں لگاتا تھا، بلکہ مکانوں کے کرایوں سے اندازہ لگاتا تھا۔ اور بڑگام کے مکانوں کے کرائے بڑھ رہے تھے۔ پگڑی بڑھ رہی تھی۔ ایک ایرانی ہوٹل والے نے اپنی دوکان کھولی تھی۔ آٹے کی تین چکیاں قائم ہو گئی تھیں۔ پولیس کی دو چوکیاں کُھل گئی تھیں۔ ظاہر ہے یہ جگہ بڑی ترقی کر رہی تھی اور اشوک ڈھا کے جو مکانی جائیداد کی قدر و قیمت سمجھتا تھا اکثر یہ سوچ کے دل مسوس کے رہ جاتا کہ نواسری کی آبادی اور بڑگام کی آبادی کے درمیان اس سنسان اکیلی سڑک پر اتنی زمین سنسان اور بنجر پڑی ہے۔ یہاں اگر کوئی ہمت والا مکان بنوانا شروع کرے تو دو سال

ہی میں اس زمین کی قیمت آج سے پچاس گنی بڑھ جائے گی۔ اسے افسوس اس بات کا نہیں تھا کہ اسے سڑک پر چلتے چلتے ایسا بیش قیمت خیال آیا تھا۔ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ کہیں یہ بیش قیمت خیال کوئی دوسرا نہ چُرالے، کیوں کہ اپنی تمام تپسیا اور اسٹاک ایکسچینج کی ہیرا پھیری کے باوجود جو ایک طرح کی تپسیا ہی ہے۔ اشوک ڈھاکے بدستور ایک غریب اور قلاش دلال تھا، جس کے بچے گلیوں میں ننگ دھڑنگ پھرتے تھے اور جس کی بیوی ہر روز پتلی چپاتیاں اور ان سے بھی پتلی دال کھا کھا کر بھُنے ہوئے پاپڑ کی طرح کھُردری اور چڑچڑی ہوئی لیکن یہ صرف دو سال پہلے کی بات ہے۔ ان دو سالوں میں اشوک ڈھاکے کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ اب وہ نواسری کی کھولی میں نہیں رہتا۔ اس نے وہ تنگ و تاریک کمرہ چھوڑ کر ایک عالیشان بنگلے کو آباد کیا ہے۔ اس کی بیوی اب شہد کی طرح میٹھی اور ریشم کی طرح ملائم ہو گئی ہے اور اس کے بچّوں کے گال پھولوں کی طرح خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اشوک ڈھاکے نے کوئی کایا کلپ کی دوا کھالی ہے، یا اس کی بیوی نے بندر کے غدود لگوا لئے ہیں، یا اس نے اپنے پُرانے بچّے یتیم خانے میں ڈال دیئے ہیں اور نئے بچّے مالا بار ہل کی کسی کوٹھی سے اغوا کر کے لایا ہے۔ ایسی کوئی خلافِ تہذیب اور خلافِ قانون حرکت اس نے نہیں کی۔ وہی وہ ہے، وہی اس کی بیوی ہے۔ وہی اس کے بچّے ہیں۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پنڈت ہری بلبھ کی جیوتش بدیا کے زور پر اس نے اسٹاک ایکسچینج سے دو ہی گھنٹے میں سات لاکھ روپے کما لئے۔ یہ ٹپ اسے پنڈت ہری بلبھ نے اپنے بزرگوں کی پُرانی پتری سے نکال کے دیئے تھے اور اس لئے کبھی خطا نہیں جا سکتے تھے۔ پانچ سال سے متواتر اشوک ڈھاکے پنڈت ہری بلبھ کی خدمت کر رہا تھا۔ آخر اسے اس کا پھل ملا تھا۔ آج لکشمی دیوی مہربان ہو کر اس کے گھر آئی تھی۔ اور اشوک ڈھاکے نے بھی مہربان ہو کر پنڈت ہری بلبھ کو اس کے تاریک جھونپڑے میں سے نکال لیا۔ اور اس کے تین بچّوں اور بیوی کو اپنی فیملی کے ہمراہ بنگلے کے نوکر خانے میں پناہ دی۔ پانچسو روپے نقد انعام دیا۔ بچّوں کو نئے کپڑے سلوا دیئے اور نواسری اور بڑگام کی سنسان سڑک پر گنیش جی کے مندر میں ایک نئی مورتی استھاپت کی اور اس پر کوئی دس ہزار روپے خرچ کئے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے مندر کے سامنے سڑک کے دوسری طرف جہاں مُسلمانوں کا قبرستان تھا اور ایک جہاں جامن کے تین درخت اکٹھے ایک جگہ اُگے ہوئے تھے۔ جن کے نیچے جنات تسخیر

کرنے والا سائیں دولا بیٹھتا تھا، اس نے وہاں بھی سائیں دولے کی خدمت میں اپنا چڑھاوا بھیجا اور جامن کے درختوں کے اُوپر سبز رنگ کا پھریرا لہرایا۔ اشوک ڈھاکے کا اعتقاد تھا کہ ہندو سادھو ہو یا مُسلمان فقیر ہو، جیوتشی ہو یا عامل ہو، سبھی عزت کے لائق ہیں۔ اور یہ بات سچ بھی ہے۔ دو گھنٹے میں سات لاکھ کما لینا کوئی کھیل نہیں ہے۔ یہ جوتش بدیا کا معجزہ تھا ورنہ محنتی سے محنتی آدمی دو گھنٹے تو کیا دس جنموں میں بھی دن رات محنت کر کے سات لاکھ نہیں کما سکتا۔ اور اصل میں جیسا پنڈت ہری بلبھ شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں، تقدیر کے لکھے کو کون میٹ سکتا ہے۔ اشوک ڈھاکے کی قسمت میں سات لاکھ لکھے تھے، اسے سات لاکھ مل گئے۔ ہماری تقدیر میں سات فاقے لکھے تھے، ہمیں سات لاکھ فاقے مل گئے۔ کسی کو گلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہر آدمی پیدا ہوتے ہی اپنی تقدیر اپنے ساتھ لے کے آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تقدیر کے ساتھ ساتھ ایک جیوتشی بھی لے کے آتا ہے جو موقع بے موقع اسے بتاتا رہتا ہے کہ تیری تقدیر میں" لکھا ہے، وہ نہیں لکھا ہے۔

۲

جس دن اشوک ڈھاکے نے گنیش جی کے مندر میں نئی مورتی کی استھاپنا کی، اسی دن اُسے اس سنسان سڑک پر چلتے ہوئے خیال آیا کہ اب تو اس کے پاس روپیہ بھی ہے۔ اب وہ اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ سکتا ہے، انھیں عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ رات کو اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مشورہ کیا۔ مگر اس کی بیوی بڑی بیوقوف تھی اس نے کہا۔ دو لاکھ روپے سے اس سنسان جگہ پر بلڈنگیں بنوانے سے یہ کہیں بہتر ہوگا کہ مجھے دو لاکھ روپے کے زیور بنوا دیئے جائیں۔ پھر مسز ڈھاکے اپنے گاؤں میں جہاں سے وہ لوگ آئے تھے، ایک دھرم شالہ، ایک پاٹھ شالہ اور ایک ہنومان جی کا دیول بنوانا چاہتی تھیں۔ اس کے علاوہ مسز ڈھاکے، ڈھاکے کی ململ بھی پہننا چاہتی تھیں، جس کا نام انھوں نے کہیں سے سُن لیا تھا اور جو سُنا ہے کہ بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی دو مہینوں کے بعد ان کے سب سے چھوٹے لڑکے جگن ناتھ کا مُنڈن سنسکار بھی تھا۔ اس کے لئے وہ دوارکا جی کے مشہور پنڈتوں کو بلوانا چاہتی تھی۔ پنڈت ہری بلبھ ٹھیک تھے۔

مگر دوارکا جی کے پنڈتوں کی بات اور ہے ۔ اس کے علاوہ ابھی کل انھیں گرگام جاکے آم کا آچار بھی خریدنا ہے اور ایک نئی چپل لانی ہے ، جیسی اس روز ان کی موسی کی بیٹی کملا نے پہن رکھی تھی ۔ اور ایک کتھئی رنگ کی ساڑی بھی ، جیسی کملا نے پہنی ہوئی تھی اور .... اس کے علاوہ وہ ابھی اور فرمائش کرتیں ۔ مگر اتنے میں منّا پالنے میں پڑا پڑا چیخنے لگا اور وہ اُٹھ کے اُدھر بھاگیں ۔ اشوک ڈھاکے نے اطمینان کا سانس لیا اور پنڈت ھری بلبھ سے مشورہ کرنے کے لئے نوکر خانے کی طرف چلا گیا ۔

پنڈت ہری بلبھ نے اشوک ڈھاکے کا عندیہ سمجھ کے جوتش نکالنا شروع کیا ۔ پنڈت ہری بلبھ میں یہ بات ضرور تھی کہ وہ کئی ایک نقلی جیوتشیوں کی طرح پاکھنڈی نہیں تھے ۔ ان کے گورے گورے چندن کے ٹیکے سے سجے ہوئے چہرے پر اندھا اعتقاد اور گہرے وشواس کی جھلک تھی ۔ وہ واقعی وہی کہتے جو اُن کا جیوتش کہتا تھا اور کبھی اپنے گاہک کو خوش کرنے کے لئے اپنی رائے نہیں بدلتے تھے ۔ کئی بار ان کا جیوتش غلط بھی نکلتا تو بھی وہ یہی سوچتے ۔ ضرور مجھ سے کہیں غلطی ہوئی ہے ۔ میں نے یا تو کنڈلی غلط بنائی ہوگی یا وقت کا غلط اندازہ کیا ہوگا یا ضرور ایسی کوئی بات ہوگی ۔ یہ بات کہ جیوتش بدیا کے اندر خود کوئی غلطی ہو سکتی ہے ۔ ایسا انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا ۔ اس وقت بھی وہ آلتی پالتی مارے اس سڑک کی کنڈلی بنانے لگے ، جہاں اشوک ڈھاکے پانچ بلڈنگوں کی ایک کالونی بنانا چاہتا تھا ۔ پنڈت ہری بلبھ نے جو کنڈلی بنائی وہ کچھ اس طرح کی تھی ۔

٢
٣
٩
چندر ١٢
١١
٤
سورج
١٠
شنی
٥
٦
گرو
بدھ
راہو
٧
٨

کنڈلی دیکھ کے خود پنڈت ہری بلبھ پریشان رہ گئے ۔ ان کے ساتھ رہتے رہتے اشوک ڈھاکے کو بھی اس علم کی کچھ ٹکل سی ہو گئی تھی ، اس لئے پنڈت ہری بلبھ نے کنڈلی سیدھے اس کے سامنے رکھ دی ۔ اور اس سے کہا اب تم خود ہی بتاؤ میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں ۔ پہلے گھر

ہیں کیتو اور منگل ہیں۔ دوسرا اور تیسرا گھر خالی ہے۔ مگر چوتھے گھر میں سورج آن پڑا ہے۔" چوتھے روی جو آئی گھر، گھر نی راجا جھگڑا کرے۔ یہاں بلڈنگ باندھو گے تو تمہارے گھر میں ہمیشہ جھگڑا رہے گا۔ اور پھر کہتے ہیں۔" منگل واسا جو کری گھر۔ گھوڑا گھوڑی یعنی موٹر گاڑی اور مانکھ یعنی آدمیوں کا نقصان ہوگا۔ پھر ساتویں گھر میں دیکھو راہو بیٹھا ہے۔ دسویں میں شنی ہے۔ ساتے راہو جو کری گھر سکل گوشتی جھگڑا کرا اور دس میں شنی جو کری گھر، گھر گھرنی مرے پرے"

باپ رے باپ۔ اشوک ڈھاکے کانوں پہ ہاتھ رکھ کے چلایا۔" یہ تو بہت ہی بری کنڈلی ہے پنڈت جی۔ مگر زمین بہت اچھی ہے۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"

پنڈت ہری بلبھ نے ایک دوسری پتری نکالی۔ پہلی سے پرانی بوسیدہ اور کرم خوردہ۔ اس میں سے دیکھ کے حساب لگانے لگے۔

اکشر درگن چوگن ماترا۔ پوچھو کا نتا گامک بازتا
گاسے ناسے ایک کری توے ساتے بھاگ دھری
بیری بیر چھنو بابا بھوے گیلو بیتل پتے تورے
ایک سن جو پادے چاری۔ چھارا گام کی ہووے ماری

پنڈت جی نے سر ہلا کے کہا۔" اونہوں۔ مارا ماری ہوگی یہ سڑک بہت منحوس ہے۔ یہاں بلڈنگ بنانے کا خیال چھوڑ دو۔"

۳

یہ سڑک واقعی بڑی منحوس تھی۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد یہاں کوئی اکیلا دوکیلا سفر نہیں کرسکتا تھا۔ اجنبی مسافر اکثر لوٹے جاتے تھے۔ کئی دفعہ اس سڑک کے کنارے ٹیکسیاں الٹی ہوئی ملیں۔ کئی بار لاشیں ملیں۔ دوسرے تیسرے مہینے یہاں ایک آدھ قتل ضرور ہو جاتا۔ اور اگر کوئی اس سڑک سے بچ کے رات کے وقت گھر پہنچ جاتا تو اکثر قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے بھوت پریت، جن اور ہمزاد نظر آتے تھے، جن سے خوفزدہ ہو کر دانت کنکناتے ہوئے وہ بخار کی ہزیانی کیفیت میں گھر پہنچتا۔ سائیں دولے کو تعویذ اور گنڈے

بڑی آمدنی تھی۔ اور اب تو اس کی دیکھا دیکھی مندر کے پجاری نے بھی جنوں بھوتوں کو اُتارنے کے لئے جھاڑ پھونک کا سائیڈ بزنس شروع کر دیا تھا۔ جس میں وہ خاصا کما رہا تھا۔ اکثر رات کے وقت اس تین میل لمبی سڑک کے مختلف نشیبی حصوں سے چیخوں کی صدائیں بلند ہوتیں۔ اور کبھی مدھم مدھم روشنیاں چلتی ہوئی نظر آتیں۔ مگر نو اسری اور بڑگام کے کسی آدمی میں یہ ہمت نہ تھی کہ رات کے سناٹے میں ادھر جا کے پتہ چلا سکے کہ وہاں سڑک کے کنارے رات کے اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے۔ بمبئی کے لوگ اس سڑک کو بھوتیا سڑک کہتے اور رات کو کسی شخص کو نو اسری کے اسٹیشن سے بڑگام ٹیکسی میں بھی جانا ہوتا تو اسٹیشن کے ٹیکسی ڈرائیور انکار کر دیتے تھے۔ اور بمبئی کے ٹیکسی ڈرائیور بھی نو اسری جاتے ہوئے صاف کہہ دیتے۔ 'صاحب ہم سب جگہ جائیں گے، مگر بھوتیا سڑک پر نہیں جائیں گے۔ رات کا وقت ہے'۔

اس سڑک کے سناٹے بڑے منحوس تھے۔ شاید اسی لئے میونسپلٹی بھی اِدھر توجہ نہیں کرتی تھی۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ نو اسری کی سڑکوں پر روشنی تھی۔ اور بڑگام کی سڑکوں پر روشنی تھی۔ لیکن اس تین میل لمبی سڑک پر روشنی کا ایک قمقمہ نہ تھا۔ برسوں سے اس کی مرمت نہ ہوتی تھی اور اس میں جا بجا بڑے بڑے گڑھے پڑے ہوئے تھے جن سے کئی بار حادثے ہو چکے تھے۔ اور کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ یہی سوچ کر اشوک ڈھاکے نے اس پر اپنی کالونی بنانے کا خیال ترک کر دیا اور اپنا روپیہ اسٹاک ایکسچینج پر ایک دو نئے داؤں پر لگا دیا، جو پنڈت ہری بلبھ نے بڑی محنت سے اُسی پُرانی پتری سے نکالے تھے۔ داؤں بڑے اچھے تھے اور انھوں نے روپیہ بھی کافی کما دیا۔ بس اتنا فرق رہا کہ یہ روپیہ اشوک ڈھاکے کی جیب میں آنے کے بجائے، وسنت مراٹھے کی جیب میں چلا گیا۔ اور اشوک ڈھاکے اور پنڈت ہری بلبھ کو پھر اپنی پُرانی کھولیوں کے قریب کی گندی چالوں میں واپس جانا پڑا۔ اس حادثے کے بعد اشوک ڈھاکے اور پنڈت ہری بلبھ میں بڑی ناچاقی ہو گئی۔ اور اب اشوک ڈھاکے ہر جگہ سب سے کہتا پھرتا تھا کہ یہ پنڈت ہری بلبھ بالکل نکما بنڈل جیوتشی ہے۔ اسے کچھ آتا جاتا نہیں۔ بس ماتھے پر چندن کا ٹیکا سجانا آتا ہے۔ اس واقعہ سے پنڈت ہری بلبھ کے کاروبار پر بہت بُرا اثر پڑا اور دو تین سیٹھ، جو اس سے جیوتش لگوانے آتے تھے، انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔ اور فاقوں نے آنا شروع کر دیا۔ اسی آتے جانے کا نام

زندگی ہے۔ پنڈت جی اکثر کہتے اور پتری کھول کر حساب لگاتے۔

کرن سمان ناپے کانیؔ۔ درگھ پرمان کاپے بانیؔ
ایکے بار دو جے چھرا۔ تیجے دیر چوتھے شو درا
پانچ یم چھٹے چھتری۔ ساتے یونی آٹھے گُن
یوگی کرنا آن دونا۔ گھونا گریگو سونا
ہُنت تیرے کی۔ بس یہاں بال برابر غلطی ہوگئی؛ پنڈت ہری بلبھ نے غصے سے

اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

۴

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ جو ہو کنسٹرکشن کمپنی کو ہوائی اڈے کی تعمیر کے سلسلے میں پچاس لاکھ کا ٹھیکہ ملا۔ ہوائی اڈے کے آس پاس کی زمین نشیب میں تھی اسے بھرنے کے لئے اور تعمیر کے دیگر کاموں کے لئے مٹی اور پتھروں کی سخت ضرورت پیش آئی۔ اور جو ہو کنسٹرکشن کمپنی کو خیال آیا کہ نواسری کے پہاڑوں میں جو نواسری اور بڑگام کی سنسان سڑک کی بنجر زمینوں کے اس پار پھیلے ہوئے ہیں، وہاں پر پتھروں کی کواری قائم کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس کواری کو فوراً چالو کر دیا گیا۔ اور سنسان سڑک پر جہاں اِکّا دُکّا آدمی نظر آتے تھے، وہاں اب سینکڑوں مزدور اپنی محنت کا راگ گاتے ہوئے سُنائی دینے لگے۔ پہاڑوں سے ڈائینامیٹ کی گونج سُنائی دینے لگی۔ پتھروں اور مٹی سے بھری ہوئی لاریاں دن رات اس سڑک پر چلنے لگیں۔ اور جب لاریوں سے بھی کام کی رفتار نہیں بڑھی، تو جو ہو کنسٹرکسن کمپنی نے ایک لائٹ ریلوے کواری سے جو ہو تک بنا ڈالی؛ جو قبرستان اور مندر کے بالکل قریب سے، اسی پُرانی بھوتیا سڑک کو قطع کرتی ہوئی گزرتی تھی یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے اس سڑک سے سارے بھوت اور جن جوتے اُٹھا کے بھاگ گئے ہیں۔ لائٹ ریلوے نے پولیس کا انتظام بھی کر دیا اور جس دن سے پولیس گشت کرنے لگی، ٹیکسیوں کا اُلٹنا بند ہو گیا اور نشیبوں میں جلنے والی مدھم مدھم روشنیاں گُل ہو گئیں، اور آدھی رات کے وقت وحشیانہ چیخوں کی بجائے مسرت کے قہقہوں کی آواز سُنائی دینے لگی۔

محبت کرنے والوں کے جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس سڑک کے کنارے چاندنی راتوں میں سیر کرنے لگے۔ اب کواری پر اور جوہو کے اڈّے پر دن رات کام ہو رہا تھا اور بیچ کا یہ سنسان علاقہ چاروں طرف سے انسانی محنت سے گھر گیا تھا۔ تھوڑے دنوں میں سائیں دو ولے جن کے تعویذ گنڈوں کا کام بہت نرم پڑ گیا تھا قبرستان سے ہجرت کر گئے اور پنڈت ہری بلّبھ نے فاقوں سے تنگ آ کے لائٹ ریلوے پر جھنڈی ہلانے کا کام سنبھال لیا۔

ایک دن جب مینھ کھل کے برس چکا تھا، اور پنڈت ہری بلبھ لائٹ ریلوے کے موڑ پر جھنڈی لئے کھڑے تھے، یکایک ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے سڑک نے نیا لباس پہن لیا ہے۔ اور اپنی پرانی کُنڈلی، سانپ کی کینچلی کی طرح اتار کے پھینک دی ہے۔ بجلی کی روشنی میں یہ سڑک کس قدر خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے شانوں پر ریلوے لائن کی چوٹیاں لہرا رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں روشنی کے آویزے چمک رہے تھے۔ اس کے دل میں محبت اور محنت کے قدموں کی آہٹ تھی۔ پنڈت ہری بلبھ نے سوچا۔ میں سچ مچ زندگی بھر غلط جیوتش لگاتا رہا۔ انسان جب گھاٹیوں، سڑکوں، پلوں اور زمینوں کی تقدیر بدل سکتا ہے، تو کیا وہ اپنی تقدیر نہیں بدل سکتا؟'

سامنے سے لائٹ ریلوے کی گاڑی آ رہی تھی اور سگنل کے لئے کبوتری کی طرح کڑکڑا رہی تھی۔ پنڈت ہری بلّبھ نے اس گاڑی کی اور دیکھا اور ہری جھنڈی ہلا کر اور مسکرا کر محنت کی گاڑی کے لئے رستہ دے دیا۔

نکّڑ

سب سے پہلے میں نے تمھیں اپنے گھر کی گلی کے نکڑ پر دیکھا تھا۔ گو ہم اکٹھے رہتے تھے لڑائی جھگڑا کرتے، مار پیٹ بھی ہو جاتی، صلح بھی، لیکن میں نے تمھیں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور دیکھا تو جب تمھاری شادی ہو چکی تھی۔ اور تمھاری ناک میں ہیرے کی شبنمی بوند جگمگا رہی تھی۔ اور تمھارے سنولائے ہوئے چہرے پر گلاب کی سی موہنی آگئی تھی۔ تمھیں اس سے پہلے میں نے کیوں نہیں دیکھا تھا تمھاری آنکھوں کی اس کجلائی ہوئی سندرتا سے کیوں آگاہ نہیں ہوا تھا۔ تمھاری شخصیت کی کے تمھارے جسم کی غنائی لذت، تمھاری روح کے بے قرار آہنگ سے کیوں بے خبر رہا تھا۔ اور دیکھا تو اس وقت کیوں دیکھا جب یہ لے، یہ نغمہ، یہ آہنگ غیر کی زینتِ آغوش ہو چکا تھا۔ اور پھر تمھیں اس طرح دیکھ کر غیریت کا احساس کیوں ہوا۔ کیوں تمھارے داہنے نتھنے میں وہ شبنمی بوند اب تک لرز رہی ہے۔ تمھارے سانولے چہرے پر گلاب کی حیا نسیم صبح گاہی کی طرح جھلک رہی ہے۔ کیوں تمھاری نگاہ کے لوچ نے، اس کی ملائمت نے، اس کے ریشمین گداز لمس نے ایک ایسا میٹھا، مکمل، مستقل تاثر پیدا کر دیا ہے جو مٹائے سے نہیں مٹتا۔ جیسے میں اب بھی تمھاری آنکھوں کی چمک کو، اس نگاہِ غلط انداز کو چھو سکتا ہوں، سن سکتا ہوں، چوم سکتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ

اب ایسا نہ ہو سکے گا۔ نہیں۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ جانتا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمھاری سیندوری چوڑیوں نے اور ساری کے سرسراتے ہوئے آنچل نے نکڑ کے ہر ذرّے کو اپنے سُرخ سائے کی روشنی سے منوّر کر دیا تھا اور میری حیات کا رُواں رُواں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمھیں آج پہلی بار دیکھ رہا ہے!

اس وقت میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ تم سے پوچھ لوں۔ یہ غیریت کیوں میں تمھیں کیوں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے کیوں نہیں پہچانتی ہو۔ تمھیں پانے یا نہ پانے کی حیات انگیز مسرّت سے میری روح کیوں کانپ رہی ہے۔ سوچا کہ جب تم پھر ملوگی تو تمھیں اپنے سینے سے لگا کر یہ بات پوچھ لوں گا........ وہ لمحہ اب تک نہیں آیا...

ہر شخص نے تمھیں دیکھا ہے۔ ہر شخص نے تمھیں چوما ہے۔ جب میں نے تمھیں اپنے سینے سے لگایا اس وقت بھی تم ایک دوکاندار تھیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اور میں ایک اوباش، بدچلن شہری، اس سے کم نہیں۔ میری زندگی چوک کے کوٹھوں کے چکّر کاٹنے میں بسر ہوتی تھی۔ تمھاری آنکھوں میں کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سُرخی کی چاشنی۔ جسم پر ریشم کی سرسراہٹ۔ بالوں میں کسی نئی خوشبو کا تبسّم رچا ہوا تھا۔ کیا راز و نیاز کی باتیں تھیں۔ جن میں نہ کوئی راز تھا نہ نیاز۔ افسانہ ہائے حسن و عشق، جن میں نہ حُسن تھا نہ عشق۔ میں شعر پڑھ رہا تھا... داغ۔ امیر مینائی..... آتش.... مجروح .... اور تم میرے سینے سے لگی تھیں۔ میری جیب میں سکّے کھنکھنا رہے تھے اور تم ان کی خاطر مرے شعروں کو کڑوی گولیوں کی طرح نگل رہی تھیں۔ اور ہم دونوں خوش تھے، مریض بھی اور مرض بھی۔ پیٹنٹ دواؤں کی طرح میں نئے نئے شعر اُگل رہا تھا اور محبت کا ایک مرئی تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اور تمھاری آنکھوں کا اضمحلال گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ تمھاری افسردگی کی ملائمت نے، تمھاری بے بس تھکن کی بے چارگی نے، تمھارے مجبور احساسِ سپردگی نے مجھے ایک عجب لذّت سے آشنا کر دیا.... تم میرے سینے سے لگی تھیں اور میں اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے تمھاری جلتی ہوئی آنکھیں

چوم رہا تھا اور تم سے ٹوٹے ہوئے، لڑکھڑاتے ہوئے، اکھڑے ہوئے شرابی فقروں میں اقرار محبت کر رہا تھا۔ میں تم سے زیادہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پچھلے چھ ماہ سے میں ہر روز تمھارے ہاں آتا ہوں، تم سے محبت جتاتا ہوں۔ تمھارے جسم کی ہر لذت، تمھارے ذہن کی ہر کیفیت سے آگاہ ہوں۔ میں نے تمھیں شادی کے لیے کہہ دیا۔ تم کیوں اس وقت بے قرار ہو گئیں۔ تمھارا چہرہ میری انگلیوں کے ہالے میں تھا اور میں نے تمھارے چہرے پر اس کیفیت کا انعکاس دیکھا جو زندگی یا موت کی تخلیق پر دیکھا جاتا ہے۔ تمھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، لیکن پھر بھی یہ عجیب سا نور کیوں؟ جیسے میری نرم، گرم، بے چین انگلیوں کا ہر لمس نور کی اک کرن بن گیا تھا اور تمھارا بیضوی چہرہ اس نورانی ہالے میں تھا۔ یکایک تم مجھے مریم کی طرح مقدس نظر آئیں ..... اور تمھاری آنکھوں کی وہ سیمابی کیفیت جیسے روح انگاروں پر لوٹ رہی ہو۔ جیسے ابن مریم دار پر کھینچا گیا ہو اور انگلیوں کی ہر لرزش جلاد کی خونی کیل ہو۔ میں نے ان آنکھوں سے اس وقت تمھاری خوفناک تنہائی کا اندازہ کیا۔ تمھیں جہنم کی آگ میں سسکتے ہوئے دیکھا۔ تمھیں یسوع کی طرح پاکیزہ موت کو زندگی کے بے جان لوتھ کے حوالے کرتا پایا اور یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں تمھیں نہیں جانتا۔ اس سے پہلے تمھیں کبھی دیکھا نہ تھا۔ تم وہ رنڈی نہ تھیں جو میرے سینے سے لگی تھی بلکہ کسی سات سمندر پار کے ملک کی شہزادی تھیں۔ بہت دور کی رہنے والی اجنبی پرستانی شہزادی! کیا جادو تھا وہ، کیسا چھلاوہ تھا۔ کیوں آج تمھیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اور اس سے پہلے کیوں میں تمھیں نہیں دیکھ سکا۔ اور اتنی گہری یگانگت کے باوجود آج تم اس قدر اجنبی تھیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ یہ احساس غیریت کیوں؟.... مری روح اب تک اس تصور سے کانپ رہی ہے ... تم میرے سینے سے لگی ہو اور نور کے ہالے میں تمھارا بیضوی چہرہ ہے، اور مریم کا سا تقدس اور مسیح کا سا عجز، تمھارے چہرے سے عیاں ہے۔ میں شادی کی بات کر رہا ہوں اور تم کہیں دور چلی گئی ہو۔ برسوں مری آغوش میں رہنے کے باوجود مجھ سے ناآشنا ہو؟ جیسے تمھاری روح نے اپنے

پرسمیٹ لیے ہیں اور مائل پرواز ہے۔ تم کون ہو؟ کہاں جانا چاہتی ہو.... اور میں کیوں آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں؟

سڑک پر اس گداگر لڑکی کی پھیلی ہوئی گندی باہیں جواب میل سے اور بھی مٹیالی ہوگئی ہیں بھیک مانگتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ یہ لڑکی ہمیشہ اسی نکڑ پر بیٹھتی ہے اس کے قریب کی پٹڑی کا فرش ناہموار ہے۔ یہاں گڑھا نہیں بلکہ کچھ ابھار سا ہے جیسے یہ جگہ اپنے اندر کوڑے کرکٹ کی قبر کو چھپائے ہو۔ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے اس جگہ کے نیچے شہر بھر کا فاسد مادہ جمع ہے۔ ایک پکے ہوئے پھوڑے کی طرح۔ اور یہ لڑکی جو ہر روز یہاں بھیک مانگتی نظر آتی ہے اس شہر کا فاسد مادہ ہی تو ہے۔ اندھے سماج کا گندا پھوڑا۔ یہ میلی مٹیالی باہیں، یہ چندھیائی ہوئی آنکھیں، یہ خاک میں اٹے ہوئے رتی کی طرح بٹے ہوئے بال... "روشن جبیں، زلف عنبریں"... ناک کے نتھنوں میں مکھیاں گھسی ہوئیں، اور ان مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایسی آواز نکالتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ بھوکی ہوں غریب ہوں۔ ایک پیسہ، یہ لڑکی جوان ہے؟ بوڑھی ہے، بچی ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا، جیسے زندگی اپنی ڈگر پر چلتے چلتے تھم گئی ہو، حرکت کا احساس نہیں، بس تھم جانے کا احساس ہے۔ سمت کا اندازہ نہیں، صرف بھوک کی وسعت کا احساس ہے۔ اس کے چہرے پر مہاسے ہیں اور ہر روز یہی مہاسے، یہی مکھیوں سے اٹے ہوئے نتھنے، یہی گندی پھیلی ہوئی باہیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ پیسہ ملے نہ ملے، یہ فٹ پاتھ کا پھوڑا وہیں جوں کا توں موجود ہے۔

میں ہر روز اسے دیکھتا ہوں، یہ بھی ہر روز مجھے دیکھتی ہے۔ میں بھی اس شہر کا باشندہ ہوں۔ اس کا "مالک" ہوں" اسے بھیک دیتا ہوں۔ اسے گالیاں دیتا ہوں، اس پر رحم کھاتا ہوں، مری خوشی کے لیے، مرے سکونِ قلب کے لیے یہ کس قدر ضروری ہے۔ اگر یہ بھکارن نہ ہو تو میں کس پر رحم کھاؤں۔ کسے ایک پیسہ دے کر اپنی فراخدلی کا ثبوت دوں۔ کس سے ہمدردی جتا کر اپنی برتری کا سکہ جماؤں۔ کس کے درد کی دوا کر کے اپنی عاقبت سدھاروں۔ اس کا افلاس، اس کی بے چارگی، اس کی زبوں حالی، اس کا

فٹ پاتھ پر جاگنا، بیٹھنا، سونا، ہات پھیلا کر بین کرنا میری مسرت کے لیے میری زندگی کے لیے کس قدر ضروری ہے آہ خداوند میں تیرا کس طرح شکر ادا کروں۔ تو اپنے بندوں کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

لیکن اب یہ بھکارن چُپ چاپ بیٹھی ہے۔ ہات نہیں پھیلا رکھے ہیں۔ اور لب بھی وا نہیں۔ ان ہونٹوں سے بھیک مانگنے کی صدا نہیں آتی۔ مجھے مایوس نہ کر۔ للہ مجھے مایوس نہ کر۔ بھیک مانگو اے بی بھکارن، بھیک مانگو۔ تم نے اس سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بلّی کے بچّے کو اپنی چھاتی سے لپٹا لیا ہے اسے پھینک دو، اچھی بھکارن اپنی میلی مٹیالی باہوں سے اس خبیث کی گردن مروڑ دو۔ یہ خرخر کرتا ہوا بلّی کا بچّہ تمھارے کردار کا دُشمن ہے۔ تمھارے پیشے کا دُشمن ہے، میرے عیش و آرام کا مدفن ہے، اسے پھینک دو، اے فٹ پاتھ کی ساحرہ!

لیکن ساحرہ خود مسحور ہو گئی ہے۔ یقیناً یہ وہ بھکارن نہیں ہے جسے میں ہر روز اس نُکڑ پر دیکھتا تھا۔ آج میں اس کی جگہ کسی اور ہی کو دیکھ رہا ہوں۔ کائنات کی ایک عجیب مخلوق، آنکھوں میں ایک عجیب چمک، ہونٹوں پر ایک عجیب تبسّم، کلائیوں میں ایک عجیب گداز جسم اور چھاتی سے لپٹا ہوا وہ بلّی کا بچّہ، یقیناً یہ وہ بھکارن نہیں ہے یہ وہ فٹ پاتھ نہیں ہے، یہ وہ شہر نہیں ہے، یہ وہ کائنات نہیں ہے۔ اس معصوم مامتا کے جذبے کو تو نے کہاں سے پالیا۔ میں آج تجھے پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور تو مجھے پہچانتی نہیں۔ اے پھٹے ہوئے گریبان والی شہزادی تو پاؤں پسارے بلّی کے بچّے کو چھاتی سے لگائے، دُنیا و مافیہا سے بے نیاز اس نُکڑ کے پتھروں کے تخت پر بیٹھی ہے اور تیری پلکوں پر سات سمندروں کے موتی لرز رہے ہیں۔ اور مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ آگے بڑھ کر تیری پلکوں سے ایک آنسو ہی چن سکوں، اور تو مجھے پہچانتی نہیں۔ یہ غیریت کیوں؟ کیوں تو نے اپنی خاک و خوں کی ننگی بھوکی دُنیا میں اس شہد آگیں جذبے کو پناہ دے کر مجھے بھکاری کر دیا۔ کیا تُو اپنے بھکاری کو بھی نہیں پہچانتی جو ہر روز ہتھیلی پر ایک پیسہ رکھ کر تجھ سے مسرت کی بھیک مانگ لیا کرتا ہے۔ آج تُو اسے

بھی نہیں پہچانتی ۔ یہ کسی نئی شخصیت کا پرتو ہے جو تیری روح کی پہنائیوں میں کانپ رہا ہے!...

سالہا سال اے رفیقِ جاں، اے میری محبوب، میں نے تجھ سے محبت کی ہے۔
ان میں وہ لمحات بھی شامل ہیں جب وقت اور حیات و ممات کی حدیں بھی مٹ گئی تھیں'
اس گلی کے نکڑ کے مکان میں تجھے وہ دن بھی یاد ہوں گے جب ہات کی ایک جنبش سے'
پلکوں کے ایک اشارے سے، تبسم کی ایک لرزش سے سازِ ہستی کے تار ہم آہنگ
ہو جاتے تھے اور عشق کا نغمہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔ ہم نے اس آگ کو بار بار
چکھا ہے۔ اس آگ کے ذائقے ہیں، اس کی دوامی لذت میں کوئی فرق نہیں پایا۔ یہ
شعلہ فزوں تر ہے۔ یہ محبت جاوداں ہے تو میری زندگی کا ماحصل ہے، میں تیری
حیات کا مرکز ہوں، ایک ہی کشش ہے۔ ایک ہی محور ہے، ایک ہی شدت ہے'
جیسے ساز کے مختلف تاروں سے ایک ہی نغمے کی تعمیر ہوتی ہے، جیسے چقماق کے
دو ٹکڑوں سے ایک ہی شعلہ بلند ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے اپنے دل، روح اور قالب
کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک آہنگِ نو کی تخلیق کی ہے۔ کیوں کہ جب جسم اور جان
محبت کے آتشکدے میں ملتے ہیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ صرف آگ ہی آگ ...
شعلہ خدا ہے!

لیکن کیا تیرے دل میں اس گہری، ابر آلود، خنک شام کی یاد باقی ہے جب ہم
دونوں صوفے پر غالب کے دیوان کا مصور ایڈیشن دیکھ رہے تھے۔ اور نوکر نے ایک
تار لا کر تیرے ہاتھوں میں دیا تھا۔ تار میں صرف اتنا لکھا تھا۔ "شیکھر عراق میں مارا
گیا۔ رتن۔" یہ شیکھر وہی تھا جو تجھ سے اس وقت سے محبت کرتا تھا کہ جب تو محبت
کے جذبے کو پہچانتی بھی نہ تھی۔ اور جیسا کہ تو نے خود مجھے بتایا تھا کہ شیکھر نے ایک
بار سفیدے کے درخت کے نیچے تیرے ہونٹوں کو چوما تھا۔ تیری زندگی کا پہلا انجان
بوسہ، کیوں کہ تو اس وقت اتنی ننھی سی تھی کہ بوسے کی کرب ناک لذت سے آگاہ
بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر تو کیوں اداس ہوگئی۔ تو صوفے پر بیٹھی میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ لیکن پھر بھی تو یکایک کہیں گم ہوگئی۔ میری روح تجھے پکارتی رہ گئی اور تو پر پھڑ پھڑاتی اس حلقے کو توڑ کر کہیں بھاگ گئی۔ میری روح چلاتی رہی۔ اس نے تجھے لاکھوں آوازیں دیں۔ لیکن تو نے ایک نہ سُنی۔ شاید تیرے کان بہرے ہو چکے تھے۔ تیری زبان گنگ تیرا دل شاید کسی نئے پرانے جذبے کی شدت سے معمور ہوگیا تھا۔ شاید تو اس وقت عراق کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جا پہنچی تھی جہاں ریت کے آتشیں بستر پر شیکھر مرا پڑا تھا۔ شاید تو اس وقت سفیدے کے اس درخت کے نیچے کھڑی تھی اور تیرے لب کسی انجان بوسے کی نہ پہچانی ہوئی لذت کو پہچان رہے تھے۔ اس وقت میری باہیں نہیں، کسی غیر اجنبی نوجوان کی باہیں تری گردن میں حمائل تھیں۔ تو اس وقت میری آواز نہیں سُن رہی تھی بلکہ کسی دوسری روح کا اقرار محبت ترے تصور میں گونج رہا تھا۔ میں نے تیری آنکھوں میں آنسو چھلکتے دیکھے، تیرے ہونٹوں کو کسی نئے جذبے کے زیر اثر کانپتے دیکھا اور یکایک مجھ پر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ تو میری محبوب نہیں، اجنبی ہے۔ مجھ سے قطعاً بے گانہ ہے۔ اُس نہ مرنے والے لمحے کی خوفناک وسعت میں مجھے احساس ہوا کہ تو وہ عورت تھی جسے میں نے آج سے پہلے، اس لمحے سے پہلے کبھی نہیں دیکھا... اس لمحے کی گہری کامل، کبھی نہ مٹنے والی اجنبیت ایک خونین لکیر کی طرح میری روح پر اب تک کھنچی ہوئی ہے!

یہ میرا بچہ ہے، میرا اکلوتا بچہ۔ اس کی شکل وصورت، اس کی مسکراہٹ، اس کی تیوری کے تل سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ یہ میرے ارتقائے حیات کی دوسری منزل ہے۔ جس منزل کی تکمیل ہو چکی وہ منزل اپنے کُل ورثے کو لیے اس ننھے کے جسم و جان میں اتر آئی ہے۔ میں اسے پہچانتا ہوں، یہ مجھے پہچانتا ہے۔ گھنٹوں میری گود میں کھیلتا ہے۔ اکثر رات کو میرے سینے سے لگ کر سو جاتا ہے۔ مجھے اس سے اتنی محبت ہے کہ دفتر میں بیٹھا بیٹھا میں اپنے تخیل میں اسے اپنی گود میں

لے لیتا ہوں ، یہ ہمک ہمک کر اچھلتا ہے اور میں اس کی شرارتوں پر مسکراتا ہوں، ہنس پڑتا ہوں ۔ میرے ساتھی کلرک میری ان عجیب حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں ۔ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں اور اکثر بے اختیار ہو کر قہقہے لگاتے ہیں ۔ جاہل ! وہ کیا جانیں کہ میں اپنے اکلوتے بچے سے کھیلنے میں مصروف ہوں ! ... اور شام کو جب میں تھکا ماندہ دفتر سے گھر کی جانب قدم بڑھاتا ہوں تو اس کی موہنی صورت ہر لحظہ آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے ، قریب ہوتی جاتی ہے ۔ حتیٰ کہ میں گھر کے دروازہ پر پہنچ جاتا ہوں اور اسے دروازے پر انتظار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں ۔ اور وہ خوشی سے چلاتا ہوا ، تالیاں بجاتا ہوا ، "چچا آ دیئے ۔ چچا آ دیئے " کہتا ہوا میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے اور میں اسے اٹھا کر زور سے اپنے سینے سے لپٹا لیتا ہوں ۔ ہاں ، تُو تو سچ مچ میری روح کا حصہ ہے ۔ میرے قالب کا ٹکڑا ہے ، میرے جگر کا گوشہ ہے !!!

ایک دن جب میں دفتر سے واپس آیا تو دیکھتا ہوں کہ وہ پتھر کے چند نیلے پیلے ٹکڑوں سے کھیل رہا ہے ۔ میں نے اسے آواز دی لیکن وہ کھیلنے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے میری آواز نہیں سُنی ۔ مجھے دیکھا تک نہیں ۔ ہنستے ہوئے ، باتیں کرتے ہوئے ، پتھروں کو اُلٹ پُلٹ کرتے ہوئے وہ ان سے کھیلتا رہا ۔ میں نے پھر زور سے آواز دی ، وہ چونکا ، ہماری نگاہیں ملیں ۔ اور میں بھی جیسے چونک گیا ۔ ایک لمحے کے لیے ۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہو ۔ میں کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس ایک لمحے میں میں اپنے بچے کے لیے قطعاً اجنبی تھا ۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ان پتھر کے ٹکڑوں کو پہچانتا تھا جن کے ساتھ وہ ابھی کھیل رہا تھا ۔ وہ اس اجنبی سے خائف بھی نظر آتا تھا اور ایسی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو یوں بن بلائے اس کی دُنیا میں آ گیا تھا ۔ جہاں نیلے پیلے خوبصورت پتھروں کے ٹکڑے ، اس کے دوست اور ہمراز اس کے ساتھ کھیل رہے تھے ... آہ وہ اذیت ناک لمحہ ، میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا ۔ ہم دونوں اجنبی تھے اور زندگی کے خاموش ساحل پر

کھڑے ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہے تھے۔ تو کون ہے۔ اے اجنبی تو یہاں کیوں کھڑا ہے۔ جا مجھے اپنے دوستوں سے کھیلنے دے ... اے ننھے بچّے تو کون ہے، تو کہاں سے آیا ہے، میرے گھر کے دروازے پر پتھّر کے ان رنگین ٹکڑوں سے کیوں کھیل رہا ہے؟ ... اس ایک لمحے میں جو مجھے کائنات کی طرح بسیط معلوم ہوا۔ ایک خوفناک غیریت کا احساس ہم دونوں پر چھا گیا اور باپ اور بیٹا دونوں اجنبی تھے۔ خاموش کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہ گئے!

اور یکایک میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں۔ زندگی اور موت، محبت اور فطرت، حسن اور عشق کی حدوں کو چیرتی ہوئی یہ عریاں حقیقت مجھ تک آئی کہ تو اکیلا ہے۔ زندگی کے نکڑ پر اجنبی کی طرح کھڑا ہے اور تجھے کوئی نہیں پہچانتا۔ اور میں نے بے اختیار ہو کر دونوں ہات پھیلا دیئے اور چلا کر کہا۔ کیوں کیوں؟ اے مرے ننھے بیٹے! ... اے نکڑ کی شہزادی بھکارن ... اے طوائف ملکہ .... اے میری دمساز و غمگسار محبوب! بتا دے یہ پردہ کیسا ہے؟ یہ دیوار کیسی ہے؟ یہ احساس اجنبیت کیوں ہے؟...

∴ ∴ ∴ ∴ ∴

نغمے کی موت

ساگرہ کے بوڑھے نمبردار نے بارہ سال تک مرحومہ کے لڑکے کی پرورش کی۔ اس نے بکمال مہربانی لڑکے کا نام گلاب رائے رکھا۔ لیکن اگر وہ اس کا نام مہو، چندرو، پندرو یا گھانسی رام رکھ دیتا تو اسے منع کرنے والا کون تھا۔ یہ تو اس کے شریف الطبع ہونے کی بہترین دلیل تھی کہ اس نے ایک یتیم لڑکے کی بارہ سال تک پرورش کی اور اس کا نام گلاب رائے رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ لڑکا گلاب کی طرح خوش رنگ اور حسین تھا۔ اور اس کے چہرے اور ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی ماں کے جمالی حسن کے بہت سے اوصاف پائے جاتے تھے۔ لیکن جیسا کہ دُنیا کے ہر ایک ادیب اور شاعر نے کہا ہے کہ حسین چہرے عورتوں کو ہی زیب دیتے ہیں یا ان امیر نوجوانوں کو جنھیں زُلیخاؤں کے عشق میں مرنے کے لیے ہزاروں موقعے ملتے ہوں۔ وقت بھی ہو اور وافر پیسہ بھی ہو۔ لیکن گلاب رائے تو ایک یتیم لڑکا تھا۔ ایک غریب کسان کا بچہ۔ جس کی حیثیت گاؤں میں بوڑھے نمبردار کے ایک کمین سے بڑھ کر نہ تھی۔ غریب عورت میں خوبصورتی ہو تو بازاروں میں بک جاتی ہے۔ وہ ایک نفع دینے والی شے ہے۔ لیکن غریبوں کے بیٹوں میں خوبصورتی ایک بے کار شے ہے بلکہ اکثر مضرت رساں بھی۔ کیوں بازار میں تو کسان بچوں کے بازوؤں کی طاقت اور چھاتی کا زور بکتا

ہے ۔ اور جن کے پاس یہ دونوں چیزیں کم ہوتی ہیں ، یا کم ہو جاتی ہیں ، انھیں پیٹ بھر کر روٹی نہیں مل سکتی ۔ یہ سماج کا ایک سیدھا سادہ اصول ہے جس پر غور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ اور یہ تو گلاب رائے کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے کردار میں نسائیت کی جھلک نمایاں ہونے کے باوجود اسے دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی تھی ۔

پہلے پہل جو کام اسے بوڑھے نمبر دار نے سپرد کیا تھا ۔ وہ چنداں مشکل بھی نہ تھا ۔ اور اب جب گلاب رائے کبھی ان دنوں کو یاد کرتا تو وہ اسے اپنے ماضی کے حسین ترین لمحے معلوم ہوتے ۔ وہ دن کو بوڑھے نمبر دار کا ریوڑ سرکاری رکھ میں لے جاتا تھا ۔ جہاں گائیں بھینسیں اور بھیڑ بکریاں چرانا ایک بہت بڑا جرم تھا ۔ لیکن ساگرہ اور دیگر پہاڑی مواضع میں جو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر آباد تھے اور جہاں زمین فی کس اس قدر کم تھی کہ سال کی فصل ضرورتِ زندگی کی کفیل نہیں ہو سکتی ۔ وہاں مویشیوں کے لیے کسان لوگ اپنے کھیتوں میں سے چراگاہیں کیسے بنا سکتے تھے ۔ سرکاری رکھیں بھی ریوڑوں کے لیے بند تھیں ۔ اس لیے حالات سے مجبور ہو کر وہ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرتے رہتے تھے ۔ ورنہ ان میں کسی شیطانی قوت یا گناہ کرنے کی قوت کا دخل نہ تھا ۔ گلاب رائے بوڑھے نمبر دار کا ریوڑ دن بھر رکھ میں چراتا تھا ۔ خوبصورت دیواروں کے نیچے پلی ہوئی ہری ہری پتلی گھاس دودھ دینے والے چوپایوں کے لیے بہت عمدہ تھی اور کہیں کہیں ان دیواروں کے چھتاروں تلے چھوٹے چھوٹے قدرتی مرغزار بن گئے تھے ۔ جہاں گاؤں کے چرواہے اور چرواہیاں اکٹھے ہو کر کھیلا کرتے تھے ۔ چھ سال سے پندرہ سولہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں اسی قدرتی مکتب میں تعلیم پاتے تھے ۔ وہ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنا سیکھ جاتے ۔ اخروٹوں سے نشانہ لگاتے ۔ گیدڑ ، سُؤر ، خرگوش اور دیگر جنگلی جانوروں کے لیے زمین میں ایسے خوفناک ڈربے تیار کرتے کہ جہاں کہیں کسی درندے نے ڈربے پر پاؤں رکھا وہیں ڈربے میں اس کی ٹانگ اُلجھ کر رہ جاتی تھی ۔ پھر وہ ہزار چھڑائے لیکن ڈربہ اسے کہاں چھوڑ سکتا تھا ۔ دوسرے دن سب

اگر اپنے شکار کو ڈربے میں پھنسے دیکھ کر خوش ہوتے ۔ موزی جانوروں یعنی گیدڑ اور سُور تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے تھے کیوں کہ وہ فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور پیارے پیارے خرگوش چرواہوں کے لیے دلچسپ کھیل بن جاتے ۔ لیکن گلاب کو ڈربے بنانے میں مزہ نہ آتا تھا ۔ ہاں اپنی کوشش سے آہستہ آہستہ ریوڑوں کی تنظیم و ترتیب سے خوب واقف ہو گیا تھا ۔ انھیں اکٹھا کرنے اور جنگل میں منتشر کر دینے اور خطرے کے وقت پھر وہ سب کو جمع کر لینے کی ترکیبوں سے اب بخوبی واقف ہو گیا تھا ۔ بانسری اور الغوزہ بجانے میں بھی وہ ماہر ہو گیا تھا ۔ دوپہر کے وقت جب سورج کی کرنیں چیڑ کے لاتعداد درختوں کے ہلتے سایوں میں سے سبز گھانس پر ایک دلفریب شطرنج بن دیتیں اور ریوڑ کی آنکھیں نیند کے بار سے بند ہو جاتیں ۔ چرواہے اور چرواہیاں اپنے مختلف کھیلوں سے تنگ آ گئے ہوتے ۔ اس وقت گلاب کی بنسری کا سنہری نغمہ نیند کے ماتوں کو ایک میٹھی مدہوشی کے روپہلی مرغزاروں میں لے جاتا ۔ نوجوان چرواہوں کی نگاہیں فضا میں انوکھے مرمریں بُرج تراشنے لگتیں ۔ اور چرواہے کنکھیوں سے اپنی اپنی محبوب چرواہیوں کی طرف تکتے ۔ اس وقت چرواہیوں کے سخت اور کُھردرے ہاتھ انھیں ریشم کی طرح ملائم اور صاف معلوم ہوتے ۔ گلے میں پڑی ہوئی چاندی کی ہنسلی شعلے کی طرح تڑپنے لگتی ۔ آنکھوں میں محبت کی ملائمت اور تمتماتے ہوئے سُرخ رخساروں پر شرم کی نمی آ جاتی ۔ پریشان اور عطر و خوشبو سے ناآشنا بالوں کا ہر پیچ ایک سنہری حلقہ بن جاتا ۔ لڑکپن اور جوانی کے درمیانی وقفے کی الفت میں شباب کی سی اہلیت جنسی اور پختہ کاری تو نہیں تھی ۔ لیکن اس کی کمی کو ایک الھڑ، معصوم شریعت پورا کر دیتی ۔ اس کے نغمے کے بہاؤ میں ہر نوجوان چرواہے اور چرواہی کا دل ہچکولے لینے لگتا ۔ زندگی کا ہر تار مرتعش ہو جاتا اور گلاب کی بنسری کی دھیمی لے کے ساتھ کسی چرواہے کی آواز جنگل کو اپنی میٹھی اداسی سے بھر دیتی ۔

اس طرح میٹھے نغموں اور نیند کی ہلکی ہلکی مدہوشیوں کے درمیان جہاں حقیقت اور خواب کی حدیں مل جاتی تھیں، دوپہر گزر جاتی اور ریوڑ پھر چرنے لگتا ۔ چرواہے

انگڑائیاں لے کر اُٹھتے اور چوپایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار کر ان کی پیٹھ کو سہلاتے اور اپنی مدہوشی کو دور کرتے۔ پھر کسی چشمے کے کنارے چلے جاتے۔ جس کے عکس میں چرواہیاں اپنے چہرے صاف کرتیں۔ ہاتھ اور پاؤں دھوتیں۔ اور اکثر جھک کر وہ چند لمحوں کے لیے اپنا چہرہ چشمے کے صاف پانی میں چھپا کر اپنی آنکھیں کھول دیتیں تو انھیں ایک عجیب دُنیا نظر آتی۔ چشمے کی تہ میں ہر کنکر ایک ہیرے اور جواہرات سا تراشا ہوا محل معلوم دیتا۔ مینڈکوں کے جسم پھیل کر خوفناک دیو بن جاتے۔ پانی میں اُگی ہوئی گھاس ایک سبز جنگل کی صورت اختیار کر لیتی اور سورج کے تر تراتے ہوئے حلقے سنہری اور روپہلے میدان بن جاتے۔ جہاں پانی کی پریاں سب انسانوں کی نگاہوں سے بچ کر ناچا کرتی تھیں۔ چرواہے چشمے سے نکلتے ہوئے چھوٹے نالے میں بیٹھ جاتے اور گھاس کی سخت تیلیاں چن کر ان کی پن چکی بناتے اور نالے کے ایک ننھے سے آبشار کے مُنہ پر اسے لگا دیتے۔ گھاس کی بنی ہوئی پن چکی زور زور سے چکّر لیتی ہوئی چلتی تھی اور چرواہے اسے دیکھ کر ہنستے تھے اور اپنے انجینئری کے کمال پر خوش ہوتے تھے۔ اسی طرح کھیلوں میں سہ پہر گزر جاتی اور جب سورج جنوب مغربی سلسلہ ہائے کوہ کے پرے جانے لگتا تو چوپایوں کے گلوں میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ چرواہے واپس گاؤں میں آجاتے۔ اور گلاب کی دل کش زندگی ختم ہو جاتی۔ اب اس بوڑھے نمبردار کی گایوں اور بھینسوں کو دُہنا ہوتا۔ جانوروں کے لیے چارہ اور اناج ڈالنا ہوتا۔ مویشی خانہ میں الاؤ تیار کرنا ہوتا۔ وہ الاؤ جس میں آگ کم اور دھواں زیادہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ دھوئیں میں مچھر اور مکھیاں جانوروں کو کم ستاتی ہیں۔ رات کو اُسے دو مکی کی موٹی روٹیاں اور آل کا سالن مل جاتا۔ یا گنبار کی کڑھی اور چاول اور کرم کا اُبلا ہوا ساگ۔ ست نرائن گو گاؤں کا نمبردار تھا۔ لیکن اس کے یہاں بھی وہی کچھ پکتا تھا جو گاؤں کے غریب سے غریب برہمن کے ہاں۔ اس لیے خوراک کے معاملے میں گلاب بھی گاؤں کے دوسرے افراد سے زیادہ بدقسمت نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ست نرائن کی بیوی اکثر سالن پکاتے پکاتے اور سالن اور سالن میں نمک ڈالنے سے پہلے گلاب کے لیے سالن نکال لیا کرتی تھی۔ کیوں کہ گاؤں میں نمک کپڑے سے

بھی مہنگا تھا ۔ نمک اور گڑ ، اس لیے گلاب کا سالن اکثر بے نمک ہوتا تھا ۔ اور مکھّن کے
بغیر ، روٹیاں اکثر اُن چپڑی اور باسی ہوتی تھیں ۔ اور جب کبھی گھر میں گڑ کے میٹھے چاول پکتے تھے
اور ان کی سُہانی خوشبو لڑکوں کو بے تاب کر دیتی تو اکثر گلاب کا حصّہ بھی وہی کھا جاتے تھے
اور گُلاب کی بے تابی غم و غصّہ میں تبدیل ہو جاتی اور وہ مُنہ پھُلائے مویشی خانے میں جا کر
سو جاتا تھا ۔ کیوں کہ وہ نمبردار کے مویشی خانے کا چوکیدار تھا ۔ مویشی خانے میں چوپاؤں کے
جسموں کی کثیف بُو ، پیشاب کا امونیا اور الاؤ کا گندہ اور تیز دھواں اسے پہلے پہل بُرا معلوم
ہوتا تھا ۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں ۔ جسم پر خارش نکل آئی تھی اور وہ کئی مہینے کھانستا
رہا تھا ۔ لیکن اب وہ ان چیزوں کا عادی ہو گیا تھا ۔ خارش تو اب بھی اسے سردیوں میں نکل آتی
تھی ۔ لیکن اسے کھٹمل اور پسّو اب نہ ستاتے تھے ۔ اس کے جسم کی نسائیت دور ہو رہی تھی ۔
اس کے ہاتھوں کی لمبی اور مخروطی انگلیاں جو شاید کسی مصوّر یا عورت کی ہوتیں تو بہتر ہوتا ، اب
جسمانی کثرت سے سخت اور کھردری ہو گئی تھیں ۔ اس کے پاؤں میں بیائیاں پھوٹ آئی
تھیں اور سردیوں میں اکثر یہ بیائیاں بہت بڑھ جاتیں ۔ اور جب ساگرہ کی وادی میں برف جم
جاتی تو اسے مویشی خانے سے چوکھر نکالنے اور برف پر چلنے میں بہت دقّت ہوتی ۔ کبھی کبھی
ان بیائیوں میں سے خون رِس رِس کر بہنے لگتا ۔ اور اس کے پاؤں سوج کر بھاری ہو جاتے اور وہ
شدّتِ درد سے چلّا اُٹھتا ۔ اس نے کئی دفعہ ست نرائن کی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اسے پاؤں کے
جوتے بنوا دے ۔ لیکن ست نرائن کی بیوی ہمیشہ یہ کہہ کر اسے ٹال دیتی تھی کہ بیٹا اگلے سال
ضرور بنوا دوں گی ۔ گلاب ست نرائن کی بیوی کو ماں کہا کرتا تھا ۔ گو اُسے پتہ تھا کہ اس کی
حقیقی ماں کون تھی اور کن حالات میں گاؤں سے نکل بھاگی تھی ۔ اور کس طرح اس نے گاؤں
والوں کے کہنے کے مطابق ایک دور کے گاؤں میں خودکشی کر لی تھی ۔ اسے ان سب باتوں
کا پتہ تھا ۔ اور کئی دفعہ چرواہے اور چرواہیوں نے اُسے تنگ کرنے کی خاطر یہ باتیں جا کر
اس کے سامنے دہرائی تھیں ۔ اور دُرگا جسے وہ اس قدر پیار کرتا تھا اور جس کے لیے وہ اپنی
جان تک دینے کو تیار تھا ، اسے خاص کر بہت چڑاتی تھی ۔ اور یہ باتیں سُنتا سُنتا وہ اپنا
چہرہ اپنی میلی قمیص میں چھپا کر رونے لگتا تھا ۔ اُسے رونا بہت آتا تھا ۔ وہ ذرا سی تکلیف

پر رو دیتا اور ذراسی بات پر ہنس دیتا۔ اور چرواہوں کو اسے رُلانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ لیکن ست نرائن کی بیوی تو سچ مچ اُسے رُلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آخر ایک عورت تھی اور جمنا کے ساتھ نفرت ہوتے ہوئے بھی اسے جمنا کے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ اس کے بیٹے کو چمڑے کے جوتے بنوا دیتی لیکن وہ کیا کرے۔ خود اس کے اپنے بیٹا بیٹیوں کے پاس چمڑے کے جوتے نہیں ہوتے تھے۔ کبھی ایک کے پھٹ جاتے اور کبھی دوسرے کے۔ اور اکثر انھیں گھاس کی پول پہننی پڑتی تھی۔ بلکہ گاؤں کے اکثر افراد تو دھان کے خشک پودوں کو بُن کر پولیں تیار کر لیتے تھے اور انہی کو اپنے پاؤں میں پہنتے تھے۔ یہ پولیں چمڑے کے جوتوں سے بدرجہا بہتر ہوتیں۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے بھی اور جسمانی آرام کے خیال سے بھی۔ کیوں کہ چمڑے کے جوتے تو برف پر فوراً پھسل جاتے تھے۔ لیکن یہ دھان کے خشک پودوں سے تیار کی ہوئی پولیں کبھی دھوکا نہیں دیتی تھیں۔ یہ بات سچ ہے کہ ان پولوں سے سردی سے بچاؤ نہیں ہو سکتا تھا اور پاؤں اکثر نیلے ہو جاتے تھے اور بیائیوں سے خون بہنے لگتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے چمڑہ بہت مہنگا تھا اور موچی عوضانہ بہت مانگتے تھے۔ اور یوں بھی تو گلے اور بھینسوں کے جسموں سے بنے ہوئے جوتے برہمنوں کے پاؤں کو زیب نہیں دیتے تھے۔ اسی لیے تو گلاب کے لیے چمڑے کے جوتے کبھی نہ بن سکے تھے۔

وہ یخ بستہ سردی میں رات کو مویشی خانہ کا تنگ دروازہ بھی بند کر دیتا اور الاؤ کے دہکتے ہوئے کوئلوں میں اپنے سرد پیر ڈال دیتا۔ پیر اس قدر سُن ہو چکے تھے کہ بہت لمحے گزر جانے کے بعد ہی ان میں زندگی کی حرارت عود کرتی اور اسے انگاروں کی گرمی کا احساس ہوتا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پاؤں الاؤ میں سینکتا اور جب پاؤں اور جسم خوب گرم ہو جاتے تو اپنا دوہرا کمبل اوڑھ کر چارپائی پر دراز ہو جاتا۔ اکثر راتوں کو اُسے دُرگا کی مُورت بہت تنگ کرتی تھی۔ اور مویشی خانہ کی پھیلی ہوئی کثیف دھند میں کہ جس میں گندہ بیروزہ کی سی بدبو ہوتی تھی، وہ اپنے تیز تخیل کی مدد سے دُرگا کا شوخ چہرہ جس کے داہنے گال پر ہنستے وقت ایک دلفریب ذقن پڑتا تھا، ایک واضح صورت میں گھڑ لیتا تھا۔ دُرگا اسے بہت ستاتی تھی۔ اکثر اسے گالیاں بھی دیتی تھی اور اس کی ماں

کا قصّہ دہرایا کرتی تھی اور اسے بار بار رُلایا کرتی تھی لیکن اب رو رو کر گلاب کا رونا بہت کم ہوگیا تھا۔ شفقت کرتے کرتے اس کے جسم کی نسائیت دُور ہو چکی تھی۔ صرف اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں کسی سنہری اور اُداس کا ہلکا سا پَرتو باقی رہ گیا تھا۔ اور جب گلاب کا دل بہت رنجور ہو جاتا تو وہ اسی اُداس خواب کو اپنی بنسری کے نغمے میں ڈھال لیتا تھا۔ پھر رات کی تنہائیوں میں وہ کبھی مویشی خانے کے کواڑ کھول دیتا اور اس کی دہلیز پر بیٹھ کر اپنی سوئی ہوئی بنسری کو جگاتا۔ اس کے سانس کی لطافت سے بنسری حرکت میں آجاتی اور اس کے نغمے زیادہ گہرے ہو جاتے۔ ان کی سسک اور تڑپ اور دل کا دُکھ بڑھ جاتا۔ مدھم نغمے کے ناچتے ہوئے تال پر گاؤں کی کنواریوں کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگتا اور بوڑھی عورتوں کو کرشن مُراری یاد آجاتے۔ ایک دن بوڑھے نمبردار کی بیوی نے جسے وہ ماں کہا کرتا تھا اس سے کہا۔ "بیٹا! تم رات کو ایسی بنسی نہ بجایا کرو!"

"کیوں ماں؟"

"بیٹا میرا دل دُکھتا ہے۔ میں کل رات کو مالا پھیر رہی تھی کہ میں نے تمھاری بنسی سُنی۔ اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ میں نے سوچا کہ گوکل میں گوپیوں کے درمیان کرشن مُراری اسی طرح بنسی بجاتے ہوں گے۔ بیٹا تم یہ بنسی نہ بجایا کرو۔"

لیکن اکثر راتوں میں بنسی کا یہ نغمہ دُرگا کے دل کو بھی بیتاب کر دیتا تھا۔ اور یہ جان کر کہ ان نغموں کا محبوب کون ہے، اس کے دل میں ایک نامعلوم سی خوشی گدگدی لیتی۔ بستر پر لیٹے لیٹے اس کا سارا جسم ٹوٹنے لگتا۔ اُسے اپنے گالوں پر ایک شعار سا جلتا ہوا محسوس ہوتا اور شعلے کی لپک اس کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ اور وہ چاہتی کہ کوئی اسے اپنے طاقتور بازوؤں میں لے لے اور بھینچ بھینچ کر اسے اپنے گلے سے لگا لے... کہ اس کا سانس بند ہونے لگے۔ لیکن صبح ہوتے ہی اپنے اس احساس پر شرمندگی اور ندامت سی محسوس ہوتی۔ اور جب وہ جنگل میں گلاب سے ملتی تو اس سے ایسی درشتی اور سخت کلامی سے پیش آتی کہ بچارے لڑکے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور وہ مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اور چرواہے اس کی حالت کو دیکھ کر ہنسنے اور قہقہہ لگاتے۔ لیکن جب گلاب اپنے تخیل میں دُرگا کو بلا لیتا تھا تو دُرگا

ایک مہربان دیوی کی طرح اس کے پاس آجاتی تھی، لمبی پتلی اور خوبصورت بنج کی شاخ کی طرح۔
پھر گلاب کو وہی لمحے یاد آتے جب سچ مچ درگا نے اسے پیار کرنے کا موقع دیا تھا۔ ایک بار
جب درگا نے سر درد کی شکایت کی تھی۔ اور وہ اس کا سر اپنی رانوں پر رکھ کر دو گھڑی دبا تا رہا تھا۔
ایک بار جب اس نے بنفشہ کے پھولوں کا گچھا اس کے بالوں میں ٹانک دیا تھا اور اس کی
ٹھوڑی اُٹھا کر اور اس کے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔ اور درگا
کی محبت آمیز خوشی نے اس کے دل کو خوشی سے بھر دیا تھا۔ ایک بار اُونچے اُونچے دلوروں
کے تنوں کے نیچے اُگی ہوئی گھاس کی جھاڑیوں کے درمیان جب وہ گرچ کے سُرخ سُرخ
پھل کھا رہے تھے، دُرگا نے یکایک ہاتھ بڑھا کر گرچ کے سُرخ دانے اس کے مُنہ میں
ڈال دیئے تھے اور گلاب نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اور پھر وہ دیر تک اسی طرح ایک دوسرے
کو توڑ توڑ پھل کھا رہے تھے ... لیکن ایسے لمحے گلاب کے لڑکپن میں بہت کم آئے تھے
اور اب ان لمحوں کی شیرینی اور خوبصورتی کی یاد اس کے دل میں ٹیس سی پیدا کر دیتی تھی۔

اور پھر گلاب کو موسم خزاں کی وہ شام یاد آئی کہ جب نالے میں پانی چڑھا ہوا تھا اور وہ
اور دیگر چرواہے جنوب مغربی پہاڑوں کے جنگلوں سے اپنے ریوڑوں کو چرا کر واپس گاؤں کو
لا رہے تھے۔ اُس نے دُرگا کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا تھا اور نالے میں سے گزر رہا تھا۔ وہ
آہستہ آہستہ ایک لکڑی کے سہارے چل رہا تھا۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور دُرگا اُسے
چھیڑنے کے لیے آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔

نالے کے درمیان جہاں پانی بہت زوروں پر تھا، گلاب یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور
کہنے لگا۔ "شریر لڑکی، اب میرا جی چاہتا ہے کہ تمھیں یہیں پانی میں گرا دوں۔ کیوں؟
کیسا مزہ رہے گا۔ دُرگا نے فوراً ایک چیخ مار کر گانا بند کر دیا اور زور سے اس کے گلے
سے لپٹ گئی۔ اور اپنی ٹانگیں زور سے اس کی چھاتی سے لگا لیں۔

گلاب اپنی چالاکی پر بہت خوش ہوا۔ وہ اس لمحہ کو زیادہ لمبا کرنا چاہتا تھا۔
لیکن کمبخت پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اُسے پانی کے ٹھنڈا ہونے کا احساس تھا
اور اس کے ساتھ ہی اپنے گلے میں حمائل بازوؤں کی نرمی اور گرمی اور اس کی چھاتی

پر لٹکتی ہوئی لاتوں کے حسین تناسب اور ان نازک ٹخنوں کی گولائیوں کا احساس تھا۔
لیکن پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ وہ آگے چلنے پر مجبور ہو گیا اور دُرگا نے پھر گانا شروع کر دیا۔
راستے میں گُلاب پھر ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور بولا:۔
"ایک بات کہوں۔ اگر تم بھی سچ سچ کہو؟"
"کہو، میں بھی سچ سچ کہوں گی۔"
"تمھیں شوجی کی قسم!"
"ہاں مجھے شوجی مہاراج کی قسم!"
"کیا میں تمھیں اچھا لگتا ہوں؟"
کچھ عرصہ گُلاب خاموشی سے پانی میں کھڑا رہا۔ پھر دُرگا بولی۔ نہایت سنجیدہ لہجے میں
اب تم نے جو من کی بات پوچھی ہے تو میں بھی سچ سچ کہوں گی۔ تم مجھے اچھے تو لگتے ہو
لیکن اتنے اچھے تو نہیں کہ میں تمھارے ساتھ بھاگ جاؤں اور پھر شادی تو ماں باپ کے
بس میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمھاری میری شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو تمھاری
ماں کا قضیہ ہے اور پھر... بُرا نہ ماننا.... تمھارے پاس نہ زمین ہے نہ زیور، نہ مکان... کچھ
بھی تو نہیں.... بُرا نہ ماننا گُلاب.... تُم نے من کی بات پُوچھی تھی۔
گُلاب یکایک آسمان سے زمین پر اُتر آیا۔ اُسے ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ وہ کوئی
بات نہ کہہ سکا۔ اور سچ مچ درگا کی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پانی میں چلتے
چلتے اس محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئی ہیں۔ اور وہ خود بھی ایک بے جان لوتھ
کو کندھوں پر اُٹھائے ہوئے گزر رہا ہے۔
پھر کنارہ آگیا۔ اور درگا فوراً ہی اس کے کندھوں سے اُتر پڑی اور وہ ایک دوسرے
سے آنکھیں نہ ملا سکے۔
رات کو مویشی خانے کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی بنسری کو کئی بار اُٹھایا
لیکن وہ اسے لبوں تک نہ لے جا سکا۔ اور اسے احساس ہوا کہ اب اس بنسری میں کوئی نغمہ ہی باقی
نہیں ہے!

پنڈارے

جمنا ساگرہ میں رہتی تھی۔ ساگرہ برہمنوں کا گاؤں تھا اور ہزاروں برسوں سے چلا آتا تھا۔ کشمیر کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے کہساروں میں یہ بھی ایک چھوٹے سے کہسار میں واقع تھا۔ اس کے حدود اربعہ میں صرف دو طرفیں پائی جاتی تھیں شمال مشرق اور جنوب مشرق۔ دونوں اطراف میں اُونچے اُونچے پہاڑ کھڑے تھے جو ایک تنگ بیضوی دائرہ بناتے ہوئے پھر آپس میں مل گئے تھے۔ سورج ہر روز ایک پہاڑ سے نکلتا اور دوسرے پہاڑ میں غروب ہو جاتا۔ کہسار کے اوپر اس تنگ بیضوی آسمان میں سورج کی حرکت ایک چھوٹی سی آڑی لکیر تھی۔ اور یہ آڑی لکیر ہمیشہ بدلتی رہتی۔ ساگرہ کے برہمن اس آڑی لکیر کو دیکھ کر موسم کی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا کرتے۔ گرمیوں میں اس آڑی لکیر کا پہلا سرا بالکل پہاڑی نالے کے منہ پر چلا جاتا تھا۔ اور دوسرا اس نقطے پر جہاں پہاڑی نالہ دونوں پہاڑوں کی سمٹی ہوئی حدوں کے بیچ میں سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان دنوں مکی کی فصل بوئی جاتی تھی اور مکی کے کھیتوں کے کنارے کنارے کرم کا ساگ اور مرچوں کے پودے۔ نالے کے کنارے کھیتوں میں پانی ہمیشہ کھڑا رہتا تھا۔ اس لیے یہاں دھان بویا جاتا تھا۔ کبھی کبھی نالے میں بارش کا پانی بہت زوروں پر آجاتا تھا اور دھان کا ایک آدھ کھیت بہ جاتا تھا۔ لیکن جب سردیوں میں نالہ سکڑتا ہوا

جنوب مغربی پہاڑ کے پاؤں سے جالگتا تھا۔ اس وقت ساگرہ کے براہمن نالے سے اپنا کھیت واپس لے لیتے تھے۔ اور اگلے سال کے دھان کے لیے ایک آدھ کیاری اور بھی بنا لیتے تھے۔ اس طرح کرتے کرتے انھوں نے قریبًا قریبًا پہاڑی نالے کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہمیشہ جنوب مغربی پہاڑ کے پاؤں سے لگ کر بہا کرے۔ قریبًا قریبًا اس لیے کہ ساگرہ کا نالہ کبھی کبھی موقعہ پاکر براہمنوں کے حکم کی خلاف ورزی کر دیا کرتا تھا۔ اور براہمن اسے کوئی سزا نہ دے سکتے تھے۔

ساگرہ میں دن کم آتے تھے اور راتیں زیادہ۔ اجلی روشنی اور چمکتی ہوئی دھوپ کم میسّر آتی۔ دن کو اکثر ملگجی سی سفیدی چھائی رہتی اور رات کو گہری سیاہی جس میں کہیں کہیں تارے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح سلگتے۔ اور سردیاں تو اکثر ایک لمبی رات ہوتی تھی جس میں بادل گھرے رہتے۔ برفیلی ہوائیں چلتیں۔ اور کبھی کبھی بجلی کوند کوند جاتی۔ ساگرہ کی دو طرفیں تھیں۔ اور دو ہی موسم گرمی اور سردی۔ یا ایک چھوٹی سی بہار اور ایک لمبی سی خزاں۔ اور فصلیں بھی دو ہی تھیں۔ مکئی اور دھان۔ لمبی سی خزاں میں تو ساگرہ کے براہمن پردیس میں نوکری کی تلاش میں چلے جاتے جہاں وہ اکثر باورچی رکھ لیے جاتے۔ یا کسی دور دراز کی منڈی سے نمک لانے کے لیے روانہ ہو جاتے۔ یا گھر پر بیٹھ کر سوت اور کپڑا بناتے۔ عورتیں صلیب نما چرخوں پر گھوں گھوں کے ساتھ کاگا کر سوت کی انٹیاں اور مرد کچے گھروں کے لیپے ہوئے آنگنوں میں لکڑی کی کیلیں ٹھونک کر سوت کے تانے بانے سے اپنی پوشش کے لیے کپڑا تیار کرتے۔ روئی چادریں، لوئیاں، لحاف، موٹا کھدر اور اپنی نوجوان بہوؤں، بہنوں اور بیویوں کے لیے سوت اور اُون کو ملا کر ایک عمدہ پتلا سا کپڑا تیار کرتے جس پر عورتیں سُرخ تاگے سے بھدّے اور بدنما پھول کاڑھ لیتیں۔

ساگرہ کے گاؤں میں بہ مشکل ایک سو گھر ہوں گے۔ ان ایک سو گھروں کی حکومت گاؤں کے سب سے بڑے بوڑھے براہمن کے سپرد تھی۔ وہ گاؤں کا نمبردار بھی تھا اور مذہبی پیشوا بھی۔ اور گاؤں سے باہر بڑی سرکار کے سامنے گاؤں والوں کی نیکی

بدی کا ذمّہ دار اور ان کا مستقل نمائندہ۔ اس گاؤں میں تو ہمیشہ ہزاروں سالوں سے بڑے بوڑھے براہمن مذہبی پیشوا اور نمبردار کی حکومت چلی آتی تھی۔ ہاں اس گاؤں سے باہر بہتوں کی حکومت آئی اور چلی گئی۔ آریہ۔ منگول۔ تاتاری۔ تبتی۔ نیپالی۔ چینی۔ مغل۔ سکھ اور اب ڈوگرہ سرکار کی حکومت تھی۔ ڈوگرہ سرکار کے بزرگ اعظم گلاب سنگھ نے اسے مُسلمان بادشاہوں کے کمزور ہوتے ہوئے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ اور پھر آخر ایک دن بڑی انگریزی سرکار نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ لے کر کشمیر پر ڈوگرہ سرکار کا حق مان کر اپنی منظوری کی مُہر ثبت کردی تھی۔ لیکن ان باہر کی بدلتی ہوئی حکومتوں نے ساگرہ کے گاؤں والوں کو نہ کوئی فائدہ پہنچایا تھا اور نہ ہی کوئی خاص نقصان۔ سینکڑوں سالوں سے وہ اپنی فصل کا ایک تہائی یا چوتھائی ادا کرتے آئے تھے۔ لگان ہو یا اناج ایک ہی بات تھی۔ چوکیدارہ اور جنگل کا محصول اور پٹواری اور راکھے کا خرچ سب ان کے ذمّہ تھا۔ کبھی کبھی مالک بے گار بھی لے لیتا تھا۔ کیوں کہ جو مالک ہے وہ بیگار ضرور لے گا۔ اور پھر گو سال میں ایک ہی فصل ہوتی تھی۔ لیکن اگر تین یا چار ہوتیں تو بھی اس تخمینہ میں کیوں کر فرق پڑ سکتا سکتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ کھانے کو دو وقت روٹی مل جاتی تھی اور پہننے کو کپڑا۔ اور اگر روٹی کپڑے کی تنگی پیش آجاتی تو وہ بھگوان کی دیا سے پردیس جاکر نوکری کر سکتے تھے۔ کھانا پکا سکتے تھے۔ اور اگر کھانا پکانا نہ جانتے تو جھوٹے برتن صاف کر سکتے تھے۔ اور دو تین روپیوں کے عوض مزدوری بن سکتے تھے۔ وہ اپنی قسمت پر نہ شاکر تھے نہ رنجیدہ وہ ہزاروں سال سے ایک ہی ڈگر پر جا رہے تھے۔ انھیں اس امر کا احساس ہی نہ ہوا تھا کہ ان کی قسمت اچھی ہے یا بُری۔ کیوں کہ انھوں نے ان کے بزرگوں نے، ان کے بزرگوں کے بزرگوں نے کبھی کوئی اور قسمت دیکھی ہی نہ تھی۔

اس گاؤں میں جمنا رہتی تھی۔ جمنا کا خاوند کھیتی باڑی بھی کرتا تھا اور دُکان کا کام بھی سارے گاؤں میں صرف ایک ہی دکان تھی۔ اور ساگرہ کے چھوٹے سے کہسار میں ندی کے جنوب مغربی سرے پر واقع تھی جہاں سے ایک پگڈنڈی باہر سے آتی ہوئی ساگرہ کے گاؤں کے قریب سے نالے کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی اوپر شمال مشرق

کُہساروں میں چلی جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی کے ذریعہ سے ساگرہ کا تعلق باہر کی دُنیا سے ہوتا تھا۔ اور اسی پگڈنڈی پر جمنا کے مرحوم خاوند کی دکان تھی۔ وہ ایک دن پہاڑی نالے کو عبور کرنے کی کوشش میں بہ گیا تھا اور نالے کی طغیانی اور بڑی بڑی چٹانوں کے نکیلے کونوں نے جو پانی میں چھپے ہوئے تھے اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں کو توڑ دیا تھا۔ اس کے بازوؤں کی انگلیوں کو او کھلی میں صاف کیے دھان کی طرح جھیل دیا تھا۔ پرمیشر کی مرضی تھی کہ اس غریب براہمن کی موت اس طرح واقع ہو۔ یا اس براہمن کے پچھلے کرموں کا پھل تھا۔ اور اس کی جوان بیوہ کے نحس ستاروں کا یا اس کے ننھے سے لڑکے کا جس کی عمر اب ایک سال کی تھی۔ جمنا اپنے خاوند کے مرنے پر تنی نہ ہوئی تھی۔ وہ بہت چیخی چلائی بھی نہ تھی۔ خاوند کے مر جانے سے زیادہ اسے اپنے بیوہ ہو جانے کا غم تھا۔ وہ اب پھول سے کاڑھے ہوئے کپڑے نہ پہن سکے گی۔ چاندی کی بالیاں اور باہوں کے کڑے اور کانوں کے دو جوڑ واسے اُتارنے ہوں گے۔ اس کی رگوں میں شباب کی سرمستی کا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن اچانک اُسے احساس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ اور وہ اندر ہی اندر گھُٹ کر رہ گئی۔ یہ سوچ کر کہ اب کوئی اس کے نرم و گداز جسم کو اپنی چھاتی سے نہ لگا سکے گا، اس کے پتلے سے سُرخ لبوں اور لمبی سُرمئی پلکوں کی صف کو نہ چوم سکے گا۔ وہ بیتاب ہو گئی تھی۔ اسے اپنے خاوند پر بہت غصہ آیا تھا۔ اور اس نے شوجی کے پرانے مندر میں جا کر اپنے آپ کو دہلیز پر گرا دیا تھا۔ اور گڑگڑا کر مقدس دیوتا سے پوچھا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ظلم کیوں ہوا تھا۔ لیکن مقدس دیوتا نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تھا یا شاید وہ مقدس دیوتا کا جواب سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ کچھ بھی ہو اس وقت بھگوان کے جواب سے جمنا کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ بعد میں بوڑھے براہمن کے سمجھانے پر جمنا کا غصہ جاتا رہا۔ آہستہ آہستہ محض زندہ رہنے کی جبلی خواہش اس کے باقی جذبات پر غالب آ گئی۔ اس نے اپنے خاوند کی دوکان سنبھال لی۔ اور کھیتی باڑی کا کام ایک اور براہمن کے سپرد کر دیا۔ گاؤں کے نمبردار اور دیگر بوڑھے پنچوں نے جمنا کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ دوکان بھی کسی اور آدمی کے سپرد کر دے اور خود شوجی کے مندر میں بیٹھ کر بھگوان کو یاد کرے۔ وہ خود اس لڑکے کی

نگہداشت کرلیں گے ۔ یوں بھی تو ایک براہمن عورت کا دوکان پر بیٹھنا معیوب ہوتا ہے اور پھر جب وہ عورت ایک جوان مہاں بیوہ ہو اور جمنا جیسی حسین ۔ لیکن بدبخت جمنا نے ایک نہ مانی ۔ اس نے دوکان کا کام نہایت اچھے اصولوں پر شروع کیا ۔ وہ مسافروں سے نہایت خوش خلقی سے پیش آتی تھی اور گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی تھی ۔ اس کے خاوند کو مرے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا ۔ اور اب اس کی زندگی ایک ہندو بیوہ کی زندگی کی طرح حزیں اور افسردہ نہ تھی ۔ بلاشبہ بہت سے گاؤں کے بزرگ اس امر کو پسند نہ کرتے تھے لیکن جمنا کو اس کی پروا نہ تھی ۔ اس کا لڑکا اب دو سال کا ہوگیا تھا اور اب وہی اس کی زندگی کا مرکز تھا ۔ وہ صبح شام مندر میں پوجا کرنے جاتی اور دیوتا سے اپنے پیارے بچے کی زندگی اور صحت کا بردان مانگتی ۔ اب اس کے دل کو ایک قرار سا آگیا تھا ۔ اُکھڑے اُکھڑے قدم جم گئے تھے ۔ صرف دل میں ایک ہلکی سی چبھن ایک خفیف سی خلش رہ رہ کر جاگ اُٹھتی تھی ۔ کہ جب کبھی مسافر اسے ترستی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس وقت اس کے گالوں کی رنگت شہابی ہو جاتی اور تنفس کا دورہ تیز ہو جاتا اور وہ اپنے سارے بدن میں ایک سنسنی محسوس کرتی ۔ یہی سنسنی اسے سردی کی سنسان راتوں کے اندھیارے میں محسوس ہوتی ۔ جب اسے اپنے خاوند کا پیار یاد آتا اور وہ ایک لمبی سانس لے کر اپنے سوئے ہوئے بچے کے ننھے ننھے بازو اپنی چھاتیوں پر پھیلا لیتی اور اس کا مُنہ زور زور سے چومنے لگتی ۔ حتیٰ کہ سویا ہوا بچہ جاگ کر رونے لگتا ۔ یہ لمحے بہت تکلیف دہ ہوتے تھے ۔ لیکن جمنا کو پورا یقین تھا کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں ان پر پورا قابو پالے گی ۔ اور یہ اغلب تھا کہ وقت گزرنے پر جب شباب کا بہاؤ مدھم ہو جائے تو یہ تیز اور جنسی خلش بھی ہمیشہ کے لیے دب جائے ۔

لیکن انہی دنوں میں علاقے کے تحصیلدار صاحب نے اپنے دورہ کے لیے ساگرہ کا مقام تجویز کیا ۔

ساگرہ میں تحصیلدار کا دورے پر آنا گاؤں والوں کے لیے ایک اچنبھے کی بات تھی ۔ کیوں کہ اس دور افتادہ مقام میں افسر لوگ بہت کم دورے پر آتے تھے ۔

اور اکثر برسوں گزر جاتے اور گاؤں والوں کو پنے حاکموں کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔
یوں بھی انھیں اپنے مالکوں سے کوئی خاص پیار نہ تھا۔ اور وہ یہی بہتر سمجھتے تھے کہ انھیں
الگ تھلگ رہنے دیا جائے۔ وہ اپنے براہمن اور بڑی سرکار کے احکام کی پوری متابعت
کرتے رہیں گے۔ اور پھر یہ تو ان کی خوش نصیبی ہی تھی کہ ساگرہ ایک ایسی حقیر سی تنگنائے
میں واقع تھا جہاں کسی افسر کا دل آنے کو نہ چاہتا تھا۔ تنگ سی وادی، سنگلاخی پہاڑ، ان
کے نیچے دیودار وں کے گھنے جنگل اور دیوداروں کے نیچے چیڑھ اور دیار اور ان کے نیچے
چند کھیت، چراگاہیں، گاؤں، دھان کے کھیت اور سب سے نیچے پہاڑی نالہ ایک
چور کی طرح اس وادی میں سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ براہمنوں کے گاؤں میں قتل و
خون کہاں؟ اس لیے سینکڑوں برسوں سے یہاں کسی نے پولیس کے آدمی کی شکل بھی نہ دیکھی
تھی۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ جگہ بہت مایوس کن تھی۔ زمینوں کے جھگڑے یہاں
براہمن پنچ آپس میں ہی طے کر لیتے تھے۔ غرض یہ کہ افسر لوگوں کی دلبستگی کا کوئی سامان
نہ تھا۔ ان حالات میں تحصیلدار صاحب کا دورہ پر آنا یقیناً ایک اچنبھے کی بات تھی۔ تحصیلدار
ایک گٹھیلا، سجیلا خوبرو جوان تھا۔ چوڑی چھاتی، مضبوط ٹھوڑی اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھیں
جب جمنا نے اسے اپنی دوکان کے سامنے سے گھوڑے پر سوار گزرتے ہوئے دیکھا تو
دنگ رہ گئی۔ ساگرہ کے براہمن تو اس کے سامنے بالکل مریل ٹٹو سے دکھائی دیتے تھے۔
تحصیلدار نے ایک خاکی رنگ کی برجس پہن رکھی تھی اور سر پر خاکی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں
بید کی چھڑی، جس کے سرے پر ایک چمڑے کا پھندنا لگا ہوا تھا۔ اس کی ہر بات عجیب
تھی۔ اور جب اس نے نگاہ پھیر کر جمنا کی طرف دیکھا تھا تو جمنا کے جسم کا رواں رواں
کانپنے لگا تھا۔ وہ اس وقت ترازو میں مصری تول کر ایک مسافر کو دے رہی تھی اور وہ
ترازو چند لمحوں کے لیے اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا رہ گیا تھا۔

دن بھر تحصیلدار صاحب نے چیڑھوں کے ایک پتلے جھنڈ کے نیچے اپنا دربار لگایا۔
وہ خود ایک بید کی کرسی پر بیٹھے اور گرداور، قانون گو اور منشی متصدی ان کے پاؤں
کے قریب زمین پر۔ اس طرح حاکموں کے دربار میں ساگرہ کی رعیت کی پیشی ہوئی۔ غریب

براہمن ڈر سے مرے جا رہے تھے۔ جس طرح ہر بشر اپنے خدا سے ڈرتا ہے اور جا و بے جا اس کی خوشامد و چاپلوسی پر تُلا رہتا ہے اس طرح بلا وجہ ماسٹر کی گھُرکی سے ڈرے ہوئے بچوں کی طرح تحصیلدار کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور منشیوں اور مصدیوں کی خوشامد کر رہے تھے۔

منشی عبدالرحمٰن نے اپنی مولویانہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اے حرامزادو، وہ گھاس کے گٹھے ابھی تک نہیں پہنچے۔"

راجہ رام براہمن نے گرج کر کہا۔ "حضور کے بچّے چار گٹھوں سے کیا ہوتا ہے۔"

پھر تحصیلدار صاحب کی طرف مُڑ کر بولا۔ "حضور سالہا سال سے کسی افسر نے اس علاقہ کا دورہ نہیں کیا۔ اب اس کا نتیجہ دیکھیے۔ حضور کے تشریف لانے پر گھاس کے صرف چار گٹھے پیش کیے جاتے ہیں۔ اور مُرغی ایک بھی نہیں یہاں کے لوگ کتنے خودسر ہو گئے ہیں!"

نمبردار نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔ "حضور! منشی صاحب، یہ براہمنوں کا گاؤں ہے۔ یہاں ہم لوگ نہ مرغیاں پالتے ہیں نہ کھاتے ہیں۔ اور کوئی دوسرا گاؤں نزدیک نہیں۔"

گھسیٹا رام پیشکار نے چلّا کر کہا۔ "یہ کتا براہمن کیا بکواس کرتا ہے۔ باندھ دو اسے درخت سے اور لگاؤ کوڑے۔ تاکہ اسے افسروں کے سامنے بات کرنے کا سلیقہ آجائے۔"

بڈھا براہمن کانپنے لگا۔ تحصیلدار صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ہنسنے لگے۔ بولے۔ "نہیں، نہیں۔ یہ بے چارہ سچ کہتا ہے۔ اچھا تم یہاں کے نمبردار ہو نا؟"

"جی۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"ست نرائن حضور۔"

تحصیلدار صاحب پھر مُسکرا دیے۔ "تم بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو ست نرائن۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ آج رات کو ہمارا کیمپ کہاں لگے گا؟"

نمبردار نے فوراً جواب دیا۔ "جو جگہ حضور پسند فرمائیں وہیں..."

تحصیلدار صاحب چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے ۔" میرے خیال میں اس بڑی دوکان کی چھت اچھی رہے گی ۔ وہ دوکان جو ہم نے پیچھے راستے میں دیکھی تھی ۔"

ست نرائن بولا ۔" وہ حضور جمنا بیوہ کی دوکان ہے ۔"

" ہاں ہاں وہی ... اچھا ... وہ جمنا بیوہ کی دوکان ہے ... جمنا ۔"

" ہاں حضور وہ بیوہ ہے ۔ پارسال اُس کا خاوند رام بھروسے اس نالے میں بہ گیا تھا ... "

تحصیلدار صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا ۔" ہاں ، ہاں تو پھر وہی جگہ بہتر ہے ۔ کیوں پیشکار صاحب ؟ "

پیشکار صاحب نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا ۔" بجا فرمایا حضور نے ۔ کھُلی جگہ ہے کشادہ چھت ہے ۔ گاؤں سے باہر بھی ہے ۔ کھُلی ہوا بھی ہے ۔"

ست نرائن بولا ۔" جیسی مرضی حضور کی ۔ لیکن حضور چاہیں تو میرے مکان کی چھت پر اپنا خیمہ لگوالیں ۔ وہ چھت اس سے بھی زیادہ کھُلی اور کُشادہ ہے ... "

پیشکار بولا ۔" نہیں نہیں ، وہی جگہ بہتر رہے گی ۔"

اور مُنشی عبدالرحمٰن نے ایک آنکھ میچ کر آہستہ سے پیشکار کے کان میں کہا ۔ میں اس لونڈے کے مذاق کی داد دیتا ہوں ۔ کم بخت نے کیسی حسین مُرغی تلاش کی ہے ۔" اور یہ کہہ کر اپنی گھنی داڑھی کے ایک دو بالوں کو مسلنے لگے ۔

جمنا نے وہ رات ست نرائن نمبردار کے گھر بسر کی ۔ دوسرے دن وہ دوکان پر بھی نہ گئی ۔ تیسرے دن تحصیلدار صاحب کا خیمہ بدستور اس کی دوکان کی چھت پر لگا ہوا تھا ۔ اس طرح ایک دو دن اور گزر گئے اور تحصیلدار صاحب کو شاید ساگرہ اس قدر پسند آیا تھا کہ وہ اس گاؤں سے ہلنے کا نام نہ لیتے تھے ۔ دن بھر دیودار کے جنگلوں میں شکار کرتے ، ریچھ اور سور مارتے یا جنگلی کبوتر ۔ اور شام کو اپنا دربار لگاتے ، جہاں گاؤں والوں کی پیشی ہوتی تھی اور گاؤں کے مالیانے اور معافی کے متعلق تنقیحیں نکالی جاتی تھیں ۔ اور تحصیلدار صاحب کا اندازہ تھا کہ اس گاؤں کا مالیانہ بڑھنا چاہیے ۔ وہ خیال کرتے

تھے کہ اس گاؤں کے براہمن بہت بدمعاش ہیں اور جنگل میں بہت چوری کرتے ہیں۔ بلا اجازت لکڑیاں کاٹتے ہیں۔ بنفشہ اکھیڑ لاتے ہیں۔ اور انار دانہ تیار کرتے ہیں۔ وہ ضرور جنگلات کے محکمہ کو لکھیں گے کہ ان چیزوں کا انسداد ہو۔ اور پھر یہاں گاؤں والوں نے بلا اجازت بہت سی سرکاری زمین کاشت کرلی تھی اور اب پٹواری ان تمام اشخاص کو چھ چھ مہینے کے لیے جیل میں بھیج دیں گے اور ان کی زمینیں اور مکان قرق کرلیں گے۔ اور پھر اس حرامزادے نمبردار نے پچھلے سال کا بقایا لگان ابھی تک ادا نہیں کیا تھا۔ کم از کم انھیں بہت شک تھا کہ آیا وہ ہر پچھلے سالوں میں باقاعدہ لگان ادا کرتا رہا تھا۔ اور گرداور قانون گو اور پٹواری مناسب تحقیقات کے بعد تحصیلدار صاحب کے سامنے رپورٹ پیش کریں گے۔ اور تحصیلدار صاحب نے تنبیہ کرلیا تھا کہ ایسے بددیانت نمبردار کو موقوف کردیا جائے اور ڈھائی سال کے لیے جیل میں ٹھونس دیا جائے۔ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اور پیشکار صاحب کی مربیانہ اور مشفقانہ صلاح و مشورہ کے ساتھ ساگرہ کے براہمنوں نے گاؤں کی تین نوخیز بہوئیں رام دیئی، دُلاری اور کھیتری اپنے ارضی دیوتاؤں کو نذرانے میں پیش کیں۔ کیوں کہ انسان کو اپنی عزت و ناموس سے اپنی جان زیادہ پیاری ہوتی ہے اور غریب کسانوں کی زندگی کا دار و مدار چاہے وہ براہمن ہی کیوں نہ ہو، یہی زمین ہے جسے کاشت کرکے وہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور جب یہ زمین ہی قرق ہوگئی یا مالکوں نے اپنی زمین واپس لے لی تو پھر وہ غریب لوگ کیا کرسکتے ہیں۔ پیٹ کی مجبوری سب کچھ کرادیتی ہے۔ لیکن جمنا کے دل میں نہ جانے کس نے کیا پتھر کے ٹکڑے بھر دیئے تھے، وہ کم بخت ایک ہی ہٹ پر قائم تھی کہ وہ بھوکی مرجائے گی، چاہے اس کی زمین قرق ہوجائے، چاہے اس کی دوکان قرق کرلی جائے، لیکن وہ تحصیلدار کے پاس نہ جائے گی، کبھی نہ جائے گی، کبھی نہ جائے گی۔ اُسے اپنے مرنے والے خاوند کی سوگند، اپنے ننھے بیٹے کی قسم!

لیکن جمنا کی یہ ہٹ گاؤں والوں کے حق میں مفید نہ تھی۔ اب تو گاؤں کے ایک دو بوڑھے براہمنوں کی بے عزتی بھی کی جاچکی تھی۔ ان کی سفید داڑھی کو نوچا گیا تھا اور ان کی گاڑھے کی موٹی موٹی پگڑیاں اُتار کر اُن کی چندیا پر اتنے دھپ لگائے گئے

تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ۔ اور یہ سب کچھ لگان اور آبیانے اور سرکاری زمین پر خلاف قانون قبضہ جمانے کے سلسلہ میں ہوا ۔ رام دیئی ، دُلاری اور کھیتری کی قربانی کے بعد بھی ارضی دیوتاؤں کی بھوک نہ مٹی تھی ۔ یوں تو تحصیلدار صاحب اپنی زبان سے کچھ نہ کہتے تھے لیکن دیوتاؤں کو کب کسی نے بولتے دیکھا ہے ۔ وہ خاموش رہتے ہیں ۔ لیکن پجاری جانتا ہے کہ اس کے اشٹ دیو کو کس چیز کی بھینٹ چاہیے ۔ ساگرہ کے گاؤں والے بھی جانتے تھے ۔ لیکن وہ بیحد پریشان تھے ، کیا کریں کیا نہ کریں ۔ اپنے گھر کی لڑکی ، بہن یا بہو ہوتی تو اسے کسی طرح راضی کر لیتے لیکن جمنا ، بیوہ جمنا تو ایک ہی کم ذات عورت تھی ۔ نہ وہ دوکان پر بے شرم و بے حیا بن کر مردوں کی طرح کام کرتی نہ آج یہ نوبت آتی ۔ یہ سب آفت اسی کی وجہ سے آئی تھی اور یہ آگ اسی نے لگائی تھی ۔ گھاس کے گٹھے پہنچاتے پہنچاتے دوسرے گاؤں سے انڈے ، اور مرغیاں لاتے لاتے اور مکھن اور آٹا اور باسمتی کے خوشبودار چاول دیتے دیتے وہ غریب براہمن بہت تنگ آ گئے تھے ۔ اور دن رات سوچتے تھے کہ جمنا کو کس طرح منایا جائے ۔ رام دیئی ، دُلاری اور کھیتری نے اس کے آگے اپنے دُکھوں کا رونا رویا اور بتایا کہ کس طرح اس کے لیے ، محض اس کے لیے ان کی عصمت تباہ و برباد کی گئی ، اور اب بھی وہ گاؤں والوں کو بے شرمی ، بے حرمتی اور بے حیائی سے بچا سکتی تھی ۔ اگر وہ ... اگر وہ ... مان جائے آخر اس مصیبت کے وقت وہ گاؤں والوں کے کام نہ آئے گی ؟ کیا وہ اتنی قربانی بھی نہ دے سکتی تھی ؟ اور پھر اسے طعنہ دینے والا کون تھا ۔ وہ تو ایک بیوہ ہی تھی ۔

جمنا نے جھلا کر کہا ۔ ہاں ، ہاں ، میں بیوہ ہوں ۔ اسی لیے تو تم مجھے اپنی خود غرضیوں کا آلۂ کار بنانا چاہتی ہو ۔ اگر آج میرا خاوند جیتا ہوتا تو تمھاری طرح باتیں کرنے والیوں کی زبان کھینچ لیتا ۔ اور تمھاری چوٹی پکڑ کر اس طرح گھسیٹتا کہ تمھارے یہ موم سے چمکتے ہوئے سر ایک گھڑی میں گنجے ہو جاتے ۔ کلموہیاں اپنی عصمت کو بیچ کر اب مجھ سے سودا کرنے آئی ہیں ۔"

اور کھیتری نے غصہ میں چلا کر کہا ۔ "یہ آج تم باتیں کر رہی ہو ، میں کہتی ہوں اگر تمھارا خاوند آج زندہ ہوتا تو وہ تمھاری چوٹی پکڑ کر خود اس موئے تحصیلدار کے پاس لے جاتا ، اس طرح کہ جس طرح ہمارے خاوند" ... اور کھیتری آگے کچھ نہ کہہ سکی ۔ غم و غصہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو

بھر آئے۔ اُسے روتے دیکھ کر رام دیئی اور دلاری بھی رونے لگیں اور پھر جمنا بھی۔

دوسرے دن جمنا کا دل ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ وہ جائے یا نہ جائے۔ ایک طرف کنواں دوسری طرف کھائی۔ وہ خود دیکھ رہی تھی کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے بزرگوں کی کس طرح بے عزتی و بے حُرمتی کی جا رہی تھی۔ اسے اس امر کا بھی ڈر تھا کہ لگان بڑھ جائے گا اور گاؤں والے عمر بھر اسے کوسیں گے۔ بہتوں کو سزا ہوگی۔ کئی جیل کی ہوا کھائیں گی۔ جیل؟ اس کے جی میں آیا کہ وہ خودکشی کر لے۔ پھر تو گاؤں کو اس مصیبت سے نجات مل جائیگی۔ لیکن اس کا ایک ننھا سا لڑکا تھا اور خود بھی وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ خیال اسے صرف ایک لمحہ کے لیے آیا تھا اور دوسرے لمحے میں اس نے اسے رد کر دیا۔ آخر ہوگا کیا؟ کیا وہ گاؤں والوں کے لیے یہ قُربانی نہ کر سکتی تھی؟ یہ ایک قربانی ہی تو تھی، جیسا گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے اسے بتایا تھا اور دھرم شاستروں میں اس نے پڑھا تھا، ایسی قربانیاں جائز سمجھی جاتی ہیں۔ یہ یقیناً پاپ نہ ہوگا۔ بوڑھے نمبردار نے اپنی پگڑی اتار کر جمنا کے پاؤں میں رکھ دی تھی اور اس سے گلوگیر آواز میں التجا کی تھی کہ گاؤں کو اس مصیبت سے بچالے۔ تحصیل والوں کی سختیاں ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور اگر یہی حالت رہی تو چند دنوں میں اس گاؤں میں گھاس کا ایک تنکا نہ ملے گا۔ اور ان کے ڈھور ڈنگر موسم سرما میں بھوکے مر جائیں گے۔ عجیب حالت تھی۔ اس مصیبت سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا۔ کیا وہ اپنے بوڑھے بزرگ کی استدعا کو رد کر دے گی۔

.. ..

دوسرے دن تحصیلدار صاحب ساگرہ سے رخصت ہو گئے۔ وہ بوڑھے نمبردار سے نہایت ملاطفت انداز سے پیش آئے اور انھوں نے وعدہ کر لیا کہ نہ تو وہ لگان بڑھائیں گے اور نہ ہی کسی کو جیل کی ہوا کھلائیں گے۔ بلکہ وہ بوڑھے نمبردار کے لیے ذیلداری کی سفارش کریں گے۔ یکایک انھیں احساس ہوا کہ اس گاؤں کے لوگ بہت شریف الطبع، مہمان نواز اور سرکار کے وفادار تھے۔ اور وہ حکّام بالادست کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔ منشی عبدالرحمٰن اور پیشکار گھسیٹا رام بھی بہت

خوش تھے ۔ گاؤں کے پنچوں نے ان کی مٹھی بھی گرم کر دی تھی ۔ تحصیل والے بھی خوش تھے اور تحصیل کے جانور بھی جنھیں تازہ گھاس اور نئی مکئی کے دانے ہر روز کھلائے گئے تھے ۔ جب تحصیل والوں کا قافلہ گاؤں سے چلا تو کئی من باسمتی کے خوشبودار چاول خچروں پر لدے ہوئے تھے ۔ ایک بڑے ٹوکرے میں ایک مزدور مُرغیاں لیے جا رہا تھا جو پروں کو پھڑ پھڑاتی ہوئی بار بار کٹر کٹراتی تھیں ۔ دو براہمن تحصیلدار صاحب کے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھے ۔ اور تحصیل کے باقی اہلکاروں کے ساتھ بھی اسی طرح ایک ایک آدمی لگام تھامے چلا آ رہا تھا ۔

گاؤں کی حد سے باہر آکر پیشکار نے عرض کی ۔ حضور موضع کھلا تھنہ میں چند ایک انتقال کی مسلیں ہیں ۔ یہاں سے کوئی دس کوس ہو گا ۔

گھوڑوں کی باگیں موضع کھلا تھنہ کی طرف موڑ دی گئیں ۔ پتلی سی پگڈنڈی پر چلتا ہوا یہ لمبا قافلہ خود پنڈاروں کا گروہ معلوم ہوتا تھا جو نہتی رعایا سے اپنی خون آشامیوں کا خراج وصول کرنے جا رہا ہو ۔ پگڈنڈی ایک اُونچے پہاڑ کے گرد چکر کھاتی ہوئی اُوپر اٹھتی ہوئی جا رہی تھی ۔ قافلہ چلتا گیا اور خائف براہمن خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے ۔ انھیں یقین نہ ہوا کہ تحصیل والے ان کے گاؤں سے چلے گئے ہیں اور پھر شاید کئی برس تک ادھر نہ آئیں گے ۔ انھیں خیال ہوا کہ جب وہ واپس اپنے گاؤں میں جائیں گے ، تحصیل والوں کو بدستور وہاں موجود پائیں گے ۔ بوڑھے نمبردار نے سوچا کہ تحصیل والوں کی آمد اس گاؤں کے لیے کسی بڑی سماوی آفت کا پیش خیمہ تھی ۔ اور یہ کہ آسمانی دیوتاؤں کا قہر بجلی بن کر ساگرہ پر ٹوٹے گا ۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ گیا ۔ لیکن پنڈارے اپنا خراج وصول کر چکے تھے ۔ اور اب وہ موضع کھلا تھنہ کی سمت جا رہے تھے ۔ اور انھوں نے مڑ کر ایک بار بھی موضع ساگرہ کی طرف نہ دیکھا جسے انھوں نے اب ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح ایک طرف پھینک دیا تھا ۔ آہستہ آہستہ یہ قافلہ چلتا ہوا اوپر پگڈنڈی پر پھیلے ہوئے کثیف بادلوں کے غلاف میں غائب ہو گیا ۔ اور ساگرہ کی مٹی کے بے جان بتوں میں حرکت پیدا ہوئی ۔ خشک لبوں پر زبانیں پھرنے

لگیں۔ لمبی لمبی آہیں اور آرام کے سانس۔

اس انسانی سماج میں جہاں یک جہتی اور مساوات نہیں، ظلم کی اندھی رو اُوپر سے آتی ہے اور برق کی تیز رفتاری کے ساتھ منتقل ہوتی ہوئی سماج کی نچلی تہوں میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس کی ٹھوکر سب سے زیادہ خوفناک شدید اور قہرمانی ہوتی ہے۔ سماج کے اندھے نظام کا وہ عتاب جو ساگرہ کے براہمنوں پر نازل ہوا، ایک بجلی بن کر جمنا پر ٹوٹا۔ جمنا وہ سونے کی مورت کی طرح چمکتی ہوئی جمنا، جس نے اس رات گاؤں والوں کی خاطر اپنے شباب کی تمام رعنائیاں پنڈاروں کے سردار کی حریص آغوش میں موتیوں کی طرح بکھیر دی تھیں۔ وہی جمنا آج تحصیل والوں کے چلے جانے کے بعد بوڑھے براہمنوں کے غم و غصہ کی شکار ہوئی۔ اگر جمنا یہ سمجھتی تھی کہ اس نے اپنی قربانی سے گاؤں والوں کو مشکور کر دیا تھا تو یہ اس کی بڑی بھول تھی۔ اگر وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس نے کوئی نیک کام کیا تھا تو یہ اس کی غلطی تھی۔ اگر گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا تو یہ ایک فرض تھا جو بوڑھے نمبردار پر گاؤں کو بچانے کے لیے اس پر عاید ہوتا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ وہ عورت جس کے برہنہ حسن کی بدولت ان پر یہ آفت آئی تھی، یوں گاؤں میں دندناتی پھرے اور آئے دن گاؤں والوں کو مصیبت میں پھنساتی رہے۔ کیوں کہ جب ارضی دیوتا کے مُنہ کو خون لگ جاتا ہے تو اس کی حرص بڑھ جاتی ہے۔ اور گو سب دیوتا زبان نہیں رکھتے۔ لیکن سب دیوتاؤں کی نگاہیں ایک ہوتی ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تحصیلدار صاحب کے بعد تھانے دار صاحب تشریف لے آئیں اور تھانیدار کے بعد جنگل کا فارسٹر یا محاصلات کا افسر۔

چنانچہ بہت سوچ وچار کے بعد گاؤں کی برادری نے فیصلہ کیا کہ جمنا کو برادری سے خارج کیا جائے۔ اسے اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیا جائے۔ اس کی دوکان سے سودا سلف نہ خریدا جائے۔ اس کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ چشمے سے پانی نہ بھرنے دیا جائے۔ گاؤں کی کوئی عورت اس سے کلام نہ کرے۔ اور جمنا کو یہ ترغیب دی جائے کہ

وہ جلد سے جلد گاؤں کو چھوڑ کر چلی جائے۔ برادری نے اس کے علاوہ ایک بھاری یگ
کرنے کا فیصلہ کیا تھا جہاں سب گاؤں والے پرائشچت کریں گے۔ اور جہاں رام
دیئی، دلاری اور کھیتری کو نیا جنم دیا جائے گا۔ اور شوجی مہاراج کے مقدس مندر کے
گرد ایک سو ایک دفعہ پرکرما لے کر دعا کی جائے گی کہ ساگرہ کے باشندے آئندہ اس
قسم کے عتاب سے محفوظ رہیں۔

شاید جمنا کا دل اس غیر متوقع چوٹ کو نہ سہ سکا۔ اسے پھر کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے اور اس کی روح نہایت سختی
سے کچلی گئی ہے۔ کیوں کہ اب اس کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ ایک غیر معلوم سی شے لطیف جو پہلے تھی اب نہیں ہے۔ اور کسی نے یکا یک
گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا ہے۔ اس باطنی خلا کو گاؤں والوں کے ظلم و تشدد نے اور
بھی تیز کر دیا۔ چند دن وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ رہے۔ نہ اپنے بچے
کے لیے پہلا سا پیار۔ جب عورتیں چشمے پر پانی بھرنے کے لیے مٹی کی گاگریں اٹھائے
ہوئے اس کی دوکان کے سامنے سے گزرتیں تو ان کے طعن و تشنیع کے تیر اس کے زخمی جگر
کے آر پار ہو جاتے لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں تھے جو اس کے رخساروں پر ڈھلتے اور
اس کی روح کو سیراب کر سکتے۔ چند ہی دنوں میں اس کا شباب مرگیا۔ جوانی تھی، حسن
تھا، دلفریبی تھی لیکن روح غائب ہوگئی تھی۔ اور جس دن پرائشچت کا یگ رچایا گیا اور نیلے
آسمان اور ہرے بھرے کھیت اور عورتوں کے گہنے اور ان کے نئے لباس اور بچوں کے
دلکش قہقہوں نے اس کی روح کو لرزا دیا تو وہ بے قرار ہوگئی اور بھاگی بھاگی بوڑھے نمبردار
کے پاس پہنچی اور اس کے پاؤں پہ جا گری۔ لیکن نمبردار نے اپنے مقدس پاؤں پرے کھینچ
لیے اور اسے درشتی سے جھڑک دیا اور کہا کہ وہ ایک ناپاک عورت تھی۔ اسے کوئی حق نہ
تھا کہ وہ یگ میں شامل ہو کر پرائشچت کر سکے۔ برادری کا فیصلہ سب کے لیے یکساں تھا۔
دن بھر یگ ہوتا رہا اور بوڑھے براہمن سنسکرت اور ہندی کے ملے جلے غلط اشلوک
بولتے رہے۔ ہون اور سامگری کا خوشبودار دھواں اوپر آسمان کی طرف اٹھتا رہا۔ کھیتری،

دُلاری اور رام دیئی نے نیا جنم لیا۔ گاؤں کے ہر ایک فرد نے پرائشچت کیا۔ گھی، مکی کے آٹے اور گڑ کا بنا ہوا حلوا سب میں تقسیم کیا گیا۔ لیکن جمنا کو کسی نے نہ پوچھا اور نہ ہی اسے یگ منڈپ کے نزدیک آنے دیا۔

شام کو شوجی کے مندر کے گرد پر کرما لے کر اور سنکھ اور گھڑیال بجا کر مندر کے کواڑ بند کر دیئے گئے اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بہت دیر کے بعد جمنا شو جی کے مندر کے قریب آئی۔ وہاں کوئی نہ تھا، مندر کے کواڑ بند تھے، اس نے چاہا کہ وہ بھی مندر کے گرد پر کرما لے۔ لیکن اب اسے اب کواڑ کھولنے کا اب حوصلہ نہ ہوا۔ وہیں دروازے کے باہر کھڑی ہو کر اپنی گردن میں اپنے سر کی اوڑھنی ڈال لی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت دیر وہاں کھڑی رہی۔ سورج کی آخری کرنوں کا طلائی جال چیڑھ اور دیوار کے درختوں پر پھیلتا ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا پہنچا۔ اور پھر شفق کی ایک آخری خونی لکیر میں مبدل ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ سُرخ لکیر بھی غائب ہو گئی اور پہاڑ ان کا سبزہ اور وادی اور کہسار نیلے اور سیاہ رنگوں کے ایک عجیب سے امتزاج میں کھوئے گئے۔ اور ان کے نقش ہر لحظہ غیر معین اور غیر واضح ہوتے گئے۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں جمنا کے دل نے بار بار مندر کے معبود سے پوچھا کہ آخر کیا اس کے گناہ کا کوئی کفارہ نہ تھا؟ کیا وہ سچ مچ گاؤں والوں سے زیادہ گناہ گار اور قصور وار تھی؟ لیکن جب اس کے بار بار پوچھنے پر مندر کے معبود نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور مندر کے کواڑ نہ کھلے اور رات کی تاریکی میں شو جی کا مقدس مندر اس پر ہنستا ہوا معلوم ہوا تو یکایک اس کے ایمان کی دیواریں گر گئیں۔ اس کا زخمی غرور اس کے دل میں ایک کچلے ہوئے پھنیر کی طرح بلند ہو گیا اور وہ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ آئی۔

وہ پگڈنڈی جو گاؤں سے باہر گھاٹیوں اور جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی، رات کی تاریکی میں اُمید کی آخری کرن کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس رات ساگرہ کے کسی براہمن نے اس پگڈنڈی پر گزرتی ہوئی عورت کو نہیں دیکھا۔ جس کے بال کھُلے تھے اور جس کی گردن میں ایک میلی اوڑھنی کے دو پہلو لہرا رہے تھے اور جس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ غم، نہ یاس نہ اُمید، نہ زندگی تھی نہ موت اور جو تیز تیز قدموں سے بھاگی

جا رہی تھی ۔ اس عورت کو کسی کا ڈر نہ تھا ، اس عورت کو کوئی روکنے والا نہ تھا ۔ پہاڑوں کی فضاؤں میں ایک ایسی ہیبت ناک خاموشی گھلی ہوئی تھی جیسے وہ کسی کی مٹتی ہوئی زندگی کا آخری منظر دیکھ رہے ہوں ، ایک ایسا ہولناک سناٹا جس کے پس پردہ کسی آنے والے طوفان کی گونج سنائی دیتی تھی ۔

لیکن اس رات ساگرہ کے کسی براہمن نے اس پگڈنڈی پر گزرتی ہوئی عورت کو نہیں دیکھا ۔ ہاں چند روز کے بعد انھوں نے سنا کہ موضع کھوئی راٹہ کے قریب ایک ندی کے نشیب میں ایک نوجوان عورت کی لاش پائی گئی ۔ اس کا حلیہ جمنا سے ملتا جلتا تھا ۔ گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے جمنا کے لڑکے کی پرورش کا ذمہ اپنے تئیں لیا اور جمنا کی زمین اور دوکان بھی اپنے قبضہ میں لے لی ۔

نئی شلوار

پو پھٹ چکی تھی لیکن سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ بیگماں نے پہاڑ کی ڈھلوان سے جہاں گاؤں آباد تھا، نیچے ندی کی تلہٹی پر نگاہ ڈالی۔ دھان کی پنیری کی ایک بڑی سی نکون میں اسے اپنا خاوند کام کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اتنے فاصلے سے وہ بالکل کھلونا سا دکھائی دیتا تھا۔ ان کھلونوں کی طرح ننھا اور خوبصورت جن سے وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی، چیڑ کے چنا ٹھوؤں کو اکٹھا کر کے ان میں لکڑی کی پچیاں آر پار پھنسا کر، وہ ان کے سروں پر اخروٹوں کو کھوکھلا کر کے لگا دیا کرتی تھی اور بس کھلونے تیار ہو جاتے تھے۔ سردار اور ان کے سپاہی اور ان کی بیویاں، فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ بیویوں کی مونچھیں نہیں ہوتی تھیں۔ اور جو مرد ہوتے تھے اُن کے چہروں پر مکّی کے بھٹوں کی نرم، ریشمیں کلغیاں لگا دی جاتی تھیں۔ اور اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ اس کی گُل سے محض اس لیے لڑائی ہوئی تھی کہ گُل مرد کھلونوں میں مکّی کے بھٹوں کی کالی کلغیاں لگانا چاہتا تھا اور وہ سُرخ کلغیاں پسند کرتی تھی۔ وہ دونوں بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا ہو پڑے تھے اور بیگماں نے غصّہ میں آکر گُل کا مُنہ نوچ لیا تھا۔ ہاں، اب گُل کے چہرے پر وہ نشان نہیں تھا، گو — اب گُل اکثر اس کے چہرے پر ایسے سُرخ نشان پیدا کر دیا کرتا تھا کہ چشمے پر جاتے ہوئے اس کی سہیلیاں اسے چھیڑا کرتی تھیں۔ یہ سوچ کر اس کے ہونٹ کانپے اور اس کے رخساروں پر ہلکی سی لالی دوڑ گئی۔ اسی طرح کی لالی اب مشرقی آسمان کے چہرے پر بھی دوڑ رہی تھی

جیسے سورج نے اپنی بیگماں کا منہ چوم لیا تھا۔ بیگماں چلتے چلتے لڑکھڑا سی گئی اور ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور اپنے سنہری پریشان بالوں کو سنوارتے ہوئے نیچے ندی کی تلیٹی کی طرف تکنے لگی۔ دھان کی پنیری کا رنگ چمکیلا اور گہرا سبز تھا۔ ایسا سبز رنگ تو اس نے گاؤں کے بزاز کی دوکان پر بھی نہ دیکھا تھا کہ جس کے پاس بڑے بڑے خوبصورت رنگ والے کپڑے تھے۔ پاس ہی دیوار کے دو نازک چھتارے پرغرور انداز میں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے۔ لیکن ان کا رنگ بھی تو اتنا گہرا سبز نہ تھا۔ اس سبز رنگ میں تھوڑی سی سیاہی بھی گھلی تھی، جیسے اس چشمے کے پانی میں ہوتی ہو جو بہت گہرا ہو۔ پہاڑ اور گاؤں اور وادی اور ندی سب نیند میں کھوئے گئے تھے۔ جنگل خاموش تھے، جھرنے چپ چاپ۔ وہ خود بھی آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی۔ بڑے بڑے پتھروں سے بچتی ہوئی جو پگڈنڈی پر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پتھر بھی سوئے پڑے ہیں اور انھیں جگانا مناسب نہ ہوگا۔ خود اس کے جسم میں بھی تو ایک ننھا سا کھلونا سو رہا تھا، اس کے بچپن کی کنواری آرزوؤں کی تکمیل۔ یہ خیال آتے ہی وہ ڈگمگانے لگی۔ اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی رو دوڑنے لگی۔ یہ رو، جس میں ندی کے پانی کی سی ملائمت، بجلی کی سی تیزی اور اعصابی حرکت کی سی فطری گردش موجود تھی۔ اس کے دھڑ اور پیٹ اور چھاتیوں میں گھومتی ہوئی دو نقطوں پر ختم ہو جاتی تھی۔ مثبت اور منفی .... مثبت اور منفی .... بیگماں کو اپنا سانس پھولتا ہوا معلوم ہوا۔ یکایک اس کے کانوں میں آواز آئی، جیسے کوئی درخت کے تنے پر کلہاڑا چلا رہا ہو کھٹ، کھٹ، اس نے غلط سمجھا تھا کہ وہ یا اس کا خاوند ہی آج سب سے پہلے جاگے ہیں۔ گاؤں کا بوڑھا چوکیدار روشن دین ان سے بھی پہلے اٹھا تھا اور اب ایک چیڑ کے تنے میں سے سنہری اور پتلی پتلی ویلیاں نکال رہا تھا، کھٹ، کھٹ، کھٹ، یکایک اسے خیال آیا کہ گھر میں تو ویلیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اور آج رات کو وہ ویلیوں کے بغیر آگ کیسے جلائے گی روشنی کیسے ہوگی؟ آج رات تو اسے ویلیوں کی سنہری روشنی کی بہت ضرورت ہے، آج رات وہ ویلیوں کے شعلوں کی روشنی میں اپنی نئی شلوار پہن کر دیکھے گی۔ اس

کا رنگ، اس کی پھبن ۔ وہ شلوار پہن کر اور بازو پھیلا کر گل کے سامنے ایک ناچتی ہوئی تیتری کی طرح گھوم جائے گی اور گل اسے گلے سے لگا لے گا۔ بیگماں کے لب کانپنے لگے اور اس کے چہرے پر لالی دوڑ گئی اور وہ روشن دین کے بالکل قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ گاؤں کے بوڑھے چوکیدار نے ایک لمحہ کے لیے بیگماں کی طرف مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ اپنی چھوٹی کلہاڑی کی مدد سے چیڑھ کے تنے میں سے وینیاں نکال رہا تھا۔ تنے کے جسم میں ایک گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا اور قریب ہی وینیوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹی؟" روشن دین نے اُس کی طرف مڑے بغیر پوچھا۔

"نیچے پنیری کے کھیتوں میں۔"

"گل کو میں نے صبح اِدھر سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید تیسرا پہر ہو گا میں جب بھی وینیاں نکال رہا تھا۔ یہ تنا کمبخت بڑا سخت ہے۔" بوڑھے روشن دین نے کلہاڑی سے زور زور سے ٹھوکے لگاتے ہوئے کہا۔

بیگماں خاموش کھڑی رہی۔

روشن دین بولا۔ "اب کے دھان کی پنیری اچھی ہے۔ تمھارے کھیتوں کی پنیری بھی بہت عمدہ اور مضبوط نظر آتی ہے .... گل کے ماہ کے بعد واپس آیا ہے"؟

"تین ماہ کے بعد۔"

"بارہ مولے میں ـــ کیا کرتا تھا؟ کسی لکڑی کے ٹھیکیدار کے ہاں ملازم تھا نا؟"

"ہاں، پر یہاں دھان کا کام سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ دیور بیمار ہے۔ اسی لیے میں نے بارہ مولے چٹھی لکھ بھیجی تھی۔"

"تم نے اپنے دیور کو میری جڑی کھلائی تھی۔"

"اور بھی کئی جڑی بوٹیاں کھلا چکی ہوں۔ اب جو دوا بارہ مولے سے آئی ہے وہ کھلا رہی ہوں۔"

"اللہ فضل کرے گا .... لیکن تم اس وقت کھیتوں میں کیا کرنے چلی ہو؟"

"اوہ ــــ پار والے گاؤں کے درزی کو شلوار سینے کے لیے دی تھی۔ آج اس نے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔" بیگماں نے کمزور، مدھم، شرمیلی آواز میں کہا۔

"اخاہ!" بوڑھے روشن دین نے مڑ کر بیگماں کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔ "گل بہت اچھا لڑکا ہے ..... بہت اچھا لڑکا ہے ..... نئی شلوار ..... مجھے یاد ہے دکھانس کر) جب میری بیوی نے ایک دفعہ مجھ سے ریشم کے کپڑے کی شلوار مانگی تھی اور میں نے کہا تھا کہ میں تجھے سری نگر سے لا دوں گا ..... سری نگر میں میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے اور میں ریشم کی شلوار نہ لا سکا۔ بڑی نیک بخت تھی وہ ..... اُسے عمر بھر ریشم کی شلوار پہننا نصیب نہ ہوئی ..... مرتے دم تک اس کے دل میں یہ حسرت رہی ....."

بوڑھے چوکیدار کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، کلہاڑی ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔

بیگماں نے آہستہ سے پوچھا۔ "چاچا، میں ان میں سے تھوڑی سی وینیاں لے لوں، ہمارے ہاں آج ختم ہو گئی ہیں اور ....."

"ہاں، ہاں، بیٹی، جتنی ضرورت ہو لے جاؤ ..... میں بھی آج ندی کے پار کی گھاٹی پر جاؤں گا۔ آج گنڈ پر میلہ ہے اور سڑک پر بہت سے سیاح لاریوں اور تانگوں پر جاتے ہوئے ملیں گے۔ اُمید ہے کہ میری سب وینیاں بک جائیں گی۔"

بیگماں نے وینیاں اُٹھاتے ہوئے کہا، "سنا ہے کہ گنڈ پر رات کو یہ سیاح لوگ وینیوں کی مشعلیں جلاتے ہیں!"

"بیٹی، اگر یہ باہر کے لوگ کشمیر میں نہ آئیں تو ہم لوگ بھوکوں مر جائیں ..... اللہ بڑا کارساز ہے۔"

بوڑھا پھر کھانسنے لگا اور کلہاڑی سے کھٹ کھٹ کرنے لگا۔ بیگماں وہاں سے چل دی۔ وینیوں کا گٹھا اُس نے دوپٹے میں رکھ لیا تھا۔ تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہ ندی کی تلیٹی میں پہنچ گئی۔ یکایک سورج نکل آیا اور ساری وادی میں جیسے اک "ہلچل" سی پیدا ہو گئی۔ کیڑے اور ٹڈے جو شبنمی لبادوں میں لپٹے ہوئے بے سُدھ پڑے تھے، جاگ کر

گھاس پر پھُدکنے لگے۔ کرنوں سے چھُو کر دھان کی پنیری کا رنگ اور بھی گہرا اور چمکیلا ہو گیا، اور اس کے خوشے سمندری لہروں کی طرح کھیت کی تکون میں ناچنے لگے۔ ندی کا پانی جو پہلے چُپ چاپ معلوم ہوتا ہے، یکایک موسیقی سے لبریز ہو گیا۔ موسیقی اور روشنی، نور اور نغمہ، حرکت اور زندگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں میں کوئی اضطراری قوت چھپی ہوئی ہے جو ہر اس چیز کو بیدار کر دیتی ہے جس سے سورج کی کرنیں ہم آغوش ہو جائیں۔

گُل نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے سُرخ چہرے پر پسینے کی لکیریں تھیں اور ہاتھوں میں دھان کی پنیری۔ وہ گھٹنوں تک کھیت کے پانی اور کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ اور نہایت چابکدستی سے پنیری اُکھاڑ اکھاڑ کر اسے بڑے کھیت میں مناسب فاصلے پر جما رہا تھا۔ بیگماں کھیت کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرائے۔ صبح کے پہلے اُجالے کا سونا ان کی آنکھوں میں تھا، ان کے دلوں میں، اُن کی رُوح کے گوشے گوشے میں!

"بہت جلد آن پہنچی ہو۔ ابھی تو میں آدھے کھیت میں بھی پنیری نہیں جما سکا۔" گل نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

یہ شکوہ نہیں اظہارِ تشکر تھا۔ بیگماں نے مُسکرا کر اور نگاہ پھیر کر پن چکی کی طرف دیکھا جو ندی کے دوسری طرف تھی۔ پھر اس کی مُسکراہٹ نے ندی کے پرے اس اُونچی گھاٹی کو چھو لیا جس کی چوٹی پر سے موٹر کی سڑک گزرتی تھی۔ گھاٹی کی سطحِ مرتفع سے گزر کر اس کی مُسکراہٹ اس چوٹی پر سے بھی پرے اُونچے اُونچے پہاڑوں کے سلسلہ پر جا پہنچی، وسیع اور بسیط جنگل اور شمال کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں، وہ دوسرا گاؤں جس کے درزی کو گل نے بیگماں کے لیے ایک نئی شلوار سینے کو دی تھی۔ یہ مُسکراہٹ گھوم کر پھر گل کے چہرے پر جا پہنچی۔ یہ مسکراہٹ، یہ نگاہ، یہ روشنی کی کرن!

بیگماں بولی۔ "اور واپس بھی تو آنا ہے۔ اب چلو گے تو بڑی مشکل سے وقت پر لوٹ سکو گے!"

اس کی بات سُنتے ہی گُل نے پنیری ہاتھ سے چھوڑ دی اور کھیت سے باہر

نکل آیا اور ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنی ننگی ٹانگوں سے کیچڑ اُتارنے لگا۔
سوسی کی شلوار جس کی سُرخ زمین پر سفید چمپئی پھول جھلملا رہے تھے، پہن کر بیگماں بہت خوش ہوئی۔ بیس بائیس گز کپڑے کی شلوار ہوگی، گلّ کی کی تین ماہ کی کمائی۔ بیگماں نے شلوار کو درزی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اپنے خاوند کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، کچھ پیار، کچھ غرور، کچھ شوخی۔ ہنس کر بولی۔ "اور قمیص؟ چھینٹ کی لوں گی۔"
گلّ بولا۔ "چھینٹ کی قمیص بھی بنوا دوں گا۔ دو تین مہینے اور ٹھیر جا۔ تب تک شاید ننھے کے لیے بھی کچھ بنوانا پڑے۔"
بیگماں شرم سے لال ہوگئی۔ نگاہیں نیچی کر کے بولی۔ "شرم تو نہیں آتی۔" گلّ مسکرانے لگا اور اس نے درزی کی طرف دیکھ کر آنکھ میچ لی۔
راستے میں سنبلو کی ایک بڑی سی جھاڑی نظر آئی جس پر نیلا دھاری کی گنجا بیل لپٹی ہوئی تھی۔ اس جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر بیگماں نے شلوار تبدیل کی۔ چلتے چلتے وہ نیفے کی چینٹ کو سنوارتی جاتی تھی، اور بیس بائیس گز کی شلوار کے گھیرے اور اس کے خوشنما پھولوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ نئی شلوار نے اس کی چال میں ایک نئی نزاکت اور شعریت پیدا کر دی اور اس کے قدموں میں مغرورانہ سا انداز آتا گیا۔ پھر اس نے ایک عجیب ادا سے، جو گلّ کو بہت پیاری لگی، اپنا سر گلّ کے کاندھے پر رکھ دیا، وہ کچھ عرصہ اسی طرح چلتے رہے، باہوں میں باہیں ڈالے درزی کا گھر اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ فرش زمین پر چیڑھ کے پیلے پیلے نکیلے جھومر بچھے ہوئے تھے اور ان کے قدموں کے مس سے ریشمیں کپڑوں کی طرح سرسراتے تھے گویا زمین نے بھی اک نئی شلوار پہن لی تھی۔ چیڑھ کے پیلے پیلے جھوموں کی شلوار جس پر جا بجا بنفشے کے پھولوں کی گلکاری تھی۔ درختوں کی شاخوں پر جنگلی پرند نغمہ زن تھے اور بادل دیوار اور چیڑھ کی چوٹیوں پر سے خراماں خراماں گزر رہے تھے۔ ایک پگڈنڈی وہ تھی جو جنگل کے درختوں کے اوپر تنی ہوئی تھی اور جس پر بادلوں میں رہنے والے نازک، خوبصورت اور برّاق شہزادے اور شہزادیاں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے،

رخسار سے رُخسار لگائے خوشی سے ناچتے ہوئے جا رہے تھے۔ گل کا دل بھی نامعلوم مسرت سے لبریز ہوگیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "میں تمھیں چھینٹ کی قمیص اگلے مہینے میں بنوادوں گا۔ یہ قمیص اب پُرانی ہوگئی ہے اور اس نئی شلوار کے ساتھ اچھی نہیں لگتی۔"

بیگماں کے نیم وا لب پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ اُٹھے اور گل نے جلدی سے انھیں اپنے سانس کی حلاوت اور ہونٹوں کی شہد آگیں شبنم سے بوجھل کر دیا....

پھر وہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور گل نے شوخ لہجہ میں کہا۔ "کتنے ماہ ہوگئے ہیں؟ چار یا پانچ ___؟"

بیگماں کمزور آواز میں بولی۔ "ہٹو بھی، تمھیں تو ہر وقت ...."

گل اُسے گدگداتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "سچ سچ بتاؤ چار یا پانچ؟ ___ چار یا پانچ؟"

بیگماں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ "ہائے ... اوئی ... میں مری۔"

گل نے اُسے گدگدانا چھوڑ دیا۔ بولا۔ "میں بتاؤں، ایک ننھی سی لڑکی ہوگی۔"

بیگماں بولی۔ "چھورا ہوگا، ننھی کیا تمھارے کھیت میں ہل چلائے گی؟ چھورا ہوگا، میری تو مدت سے یہی آس ہے۔"

گل سنجیدہ ہوکر بولا۔ "اماں بھی یہی چاہتی ہیں۔"

کتنی ہی دیر تک وہ دونوں اس جھرنے کے کنارے خاموش بیٹھے رہے۔ خوش آئندہ خیالوں میں ڈوبے ہوئے، چشمے کے نرم و نازک گیت، جنگل کا مسحور سناٹا، بادلوں کا رقصِ پیہم، ان سب چیزوں میں انھیں اپنے مستقبل کی سنہری تصویر نظر آئی۔ اس تصویر میں اِک ننھا سا بچہ بھی تھا جو اپنی ماں کی گود میں کلکاریاں مار رہا تھا ہنستے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے پہلا قدم اٹھا رہا تھا۔ کاؤ کی سونٹی کاندھے پر رکھے بھیڑ بکریوں کے گلّے کو جنگل میں چرانے کے لیے لے جا رہا تھا، درانتی سے گھاس کاٹ رہا تھا، اپنے باپ کے شانہ بشانہ کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا، کہیں جیسے

کوئی شہنائی سی بج اُٹھی اور بیگماں اور گل چونک اُٹھے اور مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید اس تصویر کو ان دونوں نے اکٹھے ہی دیکھا تھا۔

اسی طرح آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے، ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے بچپن اور جوانی اور آنے والی زندگی کے سیمیں لمحات میں گھومتے ہوئے ان سپنوں کو یاد کرتے ہوئے جو بیت چکے تھے، اور ان سپنوں کو دیکھتے ہوئے جو ابھی آنے والے تھے، وہ واپس موٹر کی سڑک پر آن پہنچے۔ سڑک پر اتنی رونق نہ تھی، پھر بھی کبھی اکا دُکا لاری، تانگہ یا پیدل چلنے والے سیاحوں کی ٹولی نظر آجاتی تھی۔ گل نے بیگماں کو بتایا کہ کس طرح ان سیاحوں کی آمد سے کشمیر کے لوگوں کو ہر سال لاکھوں روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ سری نگر ایک بہت بڑا شہر ہے جس کے بیچوں بیچ دریائے جہلم بہتا ہے جس پر سات پُل بنے ہیں، اور جب دھان کی فصل کٹ جائے گی تو وہ ضرور اپنی بیگماں کو سری نگر لے جایا جائے گا تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے ان شاندار نظاروں کو دیکھ لے کہ جن کے لیے دُنیا بھر کے سیاح وہاں کھنچے چلے آتے ہیں .... ایک چنار کے نیچے چار پانچ سیاح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ بیگماں اور گل اُن کے قریب سے گزرے اور بیگماں ان سیاحوں کے خوبصورت کپڑوں کی طرف حیرت سے دیکھتی رہی اور وہ سیاح بیگماں کے مثالی حُسن کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو گئے۔

چنار کے آگے ایک چھوٹا سا نالا تھا۔ اُسے پار کر کے وہ گھاٹ کی ڈھلوان کے قریب پہنچ گئے۔ دور نیچے ندی بہتی تھی جس کے ایک طرف کھلونے جیسی پن چکی تھی جس میں پانی کا جھاگ برف کے گالوں کی طرح اُڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ندی کے دوسری طرف دھان کے کھیت تھے جہاں گل صبح کام کرتا رہا تھا۔ اس سے پرے پہاڑ کے اُوپر ان کا اپنا گاؤں تھا۔ سفید کوٹھے، کھریا مٹی سے لپے ہوئے سیپ کے کھلونوں کی طرح نظر آتے تھے۔ ان میں عورتیں نازک ننھی پتلیوں کی طرح اندر یا باہر جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ سورج کی کرنوں نے گاؤں کو بھی چھو لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی بھی پتلیوں کا تماشہ ہے جن کی نازک

ڈوریاں سورج کی کرنوں کے تاروں سے بنی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

جس بلند و بالا گھاٹی پر بیگماں اور گل کھڑے تھے، اس سے دو راستے نیچے کی طرف جاتے تھے۔ ایک تو سیدھا ڈھلوان راستہ ندی کی کھڈ میں جاتا تھا اور دوسرا ترچھا، پُرپیچ راستہ جو گھاٹی پر بل کھاتا ہوا ندی کی تہ میں پہنچتا تھا۔ گل نے کہا۔ "میں اس چھوٹے راستے سے نیچے جاتا ہوں، اس حالت میں تمھارے لیے یہ راستہ خطرناک بھی ہے اور پھر یہاں پھسلن بھی بہت ہے۔ تم دوسرے راستہ سے آؤ، میں پن چکی پر تمھارا انتظار کروں گا۔"

"انتظار؟" بیگماں نے چمک کر کہا۔ "میں تم سے پہلے وہاں پہنچوں گی۔"

"ایک دفعہ پہلے بھی تم مجھ سے ایسی شرط لگا کر ہار چکی ہو۔" گل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب کے پھر بد کر دیکھ لو۔"

"رہی۔" بیگماں نے تیقن کے لہجے میں کہا۔ "دیکھو اگر میں پن چکی پر پہلے پہنچ جاؤں تو تمھیں کل ہی نئی قمیص کے لیے کپڑا خریدنا ہوگا۔ اور اگر...."

"اور اگر...." گل نے شرط کا دوسرا رُخ بتلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم ہار جاؤ تو کل دن بھر میرے ساتھ پنیری کے کھیتوں میں، گھٹنے گھٹنے کیچڑ اور پانی میں، ــــ کیوں منظور ہے؟"

"منظور ہے۔ لیکن دیکھو دوڑنا نہیں ہوگا، بس چلنا ہوگا۔"

گل نے اثبات میں سر ہلا کر ڈھلوان کے راستے پر چھلانگ لگائی اور تیز قدموں سے نیچے کی طرف جانے لگا۔ بیگماں ایک لمحہ کے لیے تو رُکی، پھر وہ بھی تیز قدموں سے دوسرے راستے پر ہولی۔ اب کی بار وہ گل کو ضرور شکست دے دے گی۔ گل خوشی سے سیٹی بجاتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ بیگماں سے بہت پہلے پن چکی پر پہنچ جائے گا۔ بیوقوف لڑکی، اس نے سوچا، بیگماں میں ابھی تک بچپن کی شوخی اور ضد موجود ہے، یوں ہی بات بات پر جھگڑ پڑتی ہے۔ بھلا اس حالت میں اُسے شرط

بدنی چاہیے تھی؟ یکایک اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بیگماں کو آواز دے اور اسے رُک جانے کے لیے کہے۔ لیکن دوسرا راستہ اب آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تھا اور اس کی آواز وہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ اس کے قدم آہستہ ہوگئے۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ شرط ہار جائے اور بیگماں کو پن چکی پر پہلے پہنچ جانے دے تو وہ شریر لڑکی کتنی خوش ہوگی۔ وہ مُسکرانے لگا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شرط ہار جائے گا۔ وہ نہایت دھیمے دھیمے قدموں سے چلنے لگا اور آخر ایک بڑی چٹان کے قریب جا کر رُک گیا۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ۔ اس نے اپنے دل میں اندازہ لگایا کہ بیگماں اگر دھیرے قدموں سے بھی چلی ہو تو اس وقت پن چکی پر پہنچ گئی ہوگی یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اُترتا ہوا پن چکی کی طرف جانے لگا۔ پن چکی سامنے نظر آرہی تھی۔ لیکن بیگماں ابھی تک وہاں نہ پہنچی تھی۔ اُس نے تو شرط ہارنے کی پوری کوشش کی تھی مگر اب ــــ یہ بیگماں کا اپنا قصور تھا کہ وہ ابھی تک نہ پہنچ سکی تھی۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ مُسکرانے لگا۔ شریر لڑکی، مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے۔ پن چکی کی دیوار کی اوٹ میں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ بھاگتا ہوا پن چکی کے دوسری جانب گیا لیکن بیگماں وہاں نہ تھی۔ وہ بیچاری ابھی غالباً راستے ہی میں تھی۔ گل نے ایک بار گھاٹی کے اوپر نظر دوڑائی اور پھر اس نے دو انگلیوں کو مُنہ میں رکھ کر زور سے سیٹی بجائی، وہ سیٹی جو بچپن میں بیگماں کو بلانے کے لیے بجایا کرتا تھا۔

سیٹی کی آواز پہاڑوں میں گونج کر خاموش ہوگئی۔

چند لمحے اسی خاموشی میں گزرے۔ پھر گل نے زور سے آواز دی۔ "بیگماں!"

پہاڑوں کے سینوں میں اک گونج سی پیدا ہوئی اور پھر وہی سناٹا چھا گیا۔

گل کو بہت غصہ آیا۔ چیخ کر بولا۔ "یہ کیا شرارت ہے؟ جواب ہی نہیں دیتی ہو۔ کہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہو؟ بس تمھاری یہی باتیں تو مجھے دق کرتی ہیں۔ یہ کیسا مذاق ہے؟"

گل دوسرے راستے پر اُوپر چڑھنے لگا۔ غصہ سے دانت پیس رہا تھا۔

ہر ایک جھاڑی کو غور سے دیکھتا ہوا اُوپر چڑھ رہا تھا۔ اگر اس وقت بیگماں مجھے کسی جھاڑی یا چٹان کی اوٹ میں دُبکی ہوئی مل جائے تو ـــــ

ایک بڑا سا پتھر اُوپر سے لڑھکتا ہوا اس کی طرف آیا۔ وہ فوراً ایک طرف کو ہٹ گیا۔ بس چند لمحوں کا فرق رہا ورنہ اس کا سر یا ٹانگیں زخمی ہو جاتیں۔

"بیگماں" اس نے چلا کر کہا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟"

آٹھ دس پتھر ایک دم نیچے لڑھکتے ہوئے آئے۔ اس کا پاؤں پھسل گیا، اور گھسٹتا ہوا نیچے ندی میں جا گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو گئے اور ماتھے سے خون نکل آیا۔

اُس نے چلا کر کہا۔ "بیگماں ـــــ بیگماں ـــــ"

دوسرے راستے کے درمیانی حصّے میں ایک موڑ کے قریب جہاں انجیر کا درخت اُگا تھا اور گھنی جھاڑیاں تھیں، اسے دو آدمی دکھائی دیئے۔ اُن کی ٹانگیں ننگی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اُٹھائے ہوئے تھے۔

گُل کا جیسے کسی نے گلا پکڑ لیا ہو۔ اُس کے خون کی روانی رُکنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے شرارے ناچنے لگے۔ وہ بھاگ کر راستے پر اُوپر چڑھنے لگا۔ لیکن اب اُن جھاڑیوں کے پیچھے سے تیسرا آدمی نمودار ہوا اور پتھروں کی جیسے بارش شروع ہو گئی۔ گُل نے پہچانا یہ وہی سیّاح تھے جو تھوڑی دیر پہلے گھاٹی کے اوپر چنار کے نیچے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک بہت بڑا پتھر تیزی سے نیچے لُڑھکتا ہوا آیا، اور اپنے ساتھ گُل کو دھکیلتا ہوا لے گیا۔

گُل ندی کے کنارے گر گیا۔ اُس کا گلا رُندھ گیا تھا۔ اور اب وہ سرگوشیوں میں چلّا رہا تھا، گھاٹی کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے التجا کر رہا تھا۔

"خدا کے لیے .... میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے .... خدا کے لیے .... میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے .... تمھیں خدا کا واسطہ .... اپنی بیوی بچوں کا واسطہ .... اللہ رسول کا واسطہ ...."

اور اوپر جھاڑیوں کی اوٹ میں سے چوتھا آدمی نمودار ہوا۔ اس کی ٹانگیں ننگی تھیں اور اس کے ہاتھ میں سوسی کی نئی شلوار تھی۔

گل نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں نے آس پاس کے پتھروں کو اپنی ہتھیلیوں میں پکڑنے کی کوشش کی لیکن پتھر اس کے لہو سے سُرخ ہو چکے تھے اور اس کی ہتھیلیوں میں سے پھسلتے گئے، اور وہ ندی کے کنارے گھٹنوں کے بل جُھک گیا۔ یکایک چمپئی سوسی کی نئی شلوار ایک ہوائی چھتری کی طرح بل کھاتی ہوئی اُس کے سامنے آن پڑی اور پتلی پتلی سنہری وینیاں پتھروں میں بکھر گئیں!

٭

پَرمَاتما

پرتما کی آنکھیں غصّے سے سُرخ ہوگئیں، اس نے خشمگیں نگاہوں سے سورگ کے بڑے پجاری کی طرف دیکھ کر کہا۔ موضع ہمیر پور میں پاسی کسان اور اس کا کنبہ کئی دنوں سے فاقے کر رہا ہے۔ اور تم نے ابھی تک اس کے لیے کچھ نہیں کیا؟

بڑا پجاری تھر تھر کانپنے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ پربھو میں نے تو بہتیری کوشش کی ہے لیکن کیا کروں اُس بیچارے کی قسمت ہی ایسی ہے۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

کیسے نہیں ہوتی۔ پرماتما نے اپنے نورانی عصا کو فرش پر ٹیک کر کہا۔ اور تمام کائنات میں نور کی بارش برس گئی۔ چلو ہم دیکھتے ہیں۔ پاسی کسان ہمارا بھگت ہے۔ وہ ہر وقت ہمیں یاد کرتا ہے۔ یہ ہمارا دھرم ہے کہ ہم مصیبت کے وقت اس کی مدد کریں

ست بچن پربھو۔ بڑے پجاری نے ماتھا ٹیک کر کہا۔

.. ..

پاسی کسان نے دروازہ کھولا۔

بڑے پجاری نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ پرماتما ہیں۔

پاسی کسان پرماتما کے چرنوں میں گر پڑا۔ میرے دھرم، میری عزت کے مالک، مجھ پر ترس کھایئے۔ دو دن سے بچے بھی بھوکے ہیں۔ ان کا بلکنا مجھ سے دیکھا نہیں

جاتا۔ اپنے بھگت کو آسرا دیجیے۔

پرماتما نے پوچھا۔ تمھارے پاس اناج تھا وہ کیا ہوا؟

بڑے پجاری نے کھاتہ دیکھ کر کہا۔ تمھارے پاس دس بیگھے زمین ہے۔ اس سال ہم نے بارش بھی اچھی مقدار میں منظور کی تھی۔ وہ سب کی سب تمھاری زمین میں پڑی۔ اس کھاتے میں اس بارش کا سارا حساب درج ہے۔ امسال بجٹ میں ہم نے قحط بھی نہیں رکھا، صرف کسانوں کی بہبودی کے لیے، تاکہ انھیں کسی قسم کی شکایت نہ رہے۔ اس پر بھی تم کہتے ہو کہ تم بھوکے ہو۔

کسان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھگوان۔ میرے پاس تھوڑا سا اناج بچا تھا، وہ بھی بنیا اُٹھا کر لے گیا۔

پرماتما نے اپنا نورانی عصا فرش پر مارا اور زمین خوف سے لرز اُٹھی! کئی جگہوں پر زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوئے اور ہزاروں مٹی کے گھروندے گر پڑے۔ پرماتما نے خشمگیں نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر کہا۔ پجاری ہمیں اس بنئے کے گھر لے چلو۔

جو آگیا! بڑے پجاری نے ہاتھ جوڑ کر ماتھا ٹیک کر کہا۔

..   ..

بنیا گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔

بڑے پجاری نے کہا۔ آپ پرماتما ہیں۔

"جی، بنئے نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔ ہی ہی ہی، چیونٹی کے گھر مہمان آئے ہیں۔ میں گریب بھو کا بنیا بھلا کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ مگر پھر بھی جو کچھ ہے بھگوان کا دیا ہے۔ آیئے۔ اندر تشریف لایئے!

چند لمحوں میں پرماتما کے ارد گرد بنئے کے بچے بالے جمع ہو گئے اور ناچنے لگے۔ ایک بچہ کندھے پر چڑھ بیٹھا اور ایک نے جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ تاروں کے جواہر شبنم کے موتی۔ چاندنی کی چاندی۔ سورج کا سونا۔ سب کچھ جیبوں میں سے نکال لیا۔

اور پھر اپنی ماں کی جھولی میں ڈال دیا۔

بنئے اور اس کی بیوی نے بھگوان کو آسن پر بٹھایا اور گلے میں ہار ڈالے ، پھر بولے۔ بھگوان ہم آپ کے لیے اس گاؤں میں ایک سہ منزلہ دھرمشالہ بنانا چاہتے ہیں ۔ لیکن ہم گریب ہیں ۔ ہمیں اتنا دھن دیجیے کہ .....

یکایک پرماتما کی آنکھیں یاقوت کی طرح چمکنے لگیں ۔ انھوں نے غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں بنئے کو ٹوک کر کہا ۔" تمھیں شرم نہیں آتی۔ تم نے پاسی کسان کے گھر سے اناج اٹھا لیا ۔ اب وہ بے چارہ بھوکا مر رہا ہے ۔

بنئے نے ڈنڈوت کی اور زمین پر سر رکھ کر بولا ۔ میرے پاس جو کچھ ہے بھگوان کا ہے ۔ لیکن ایک عرض ہے کہ پچھلے سال جب قحط پڑا تھا ۔ میں نے پاسی کسان کو چار من گیہوں قرض دیا تھا ۔ وہ قرض بمع سود چکانا نہیں چاہتا تھا ۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے رضامند کیا ۔ اس نے اپنی مرضی سے مجھے اناج دیا ہے مہاراج ۔

چار من گیہوں پر سود کتنا لگتا ہے ؟ پرماتما نے پوچھا ۔

صرف چار من ، بھولے بادشاہ ، اے بھگوان ، دیالو ! صرف چار من !

پرماتما نے بڑے پجاری کی طرف دیکھا ۔ اس نے کھاتہ کھول کر ورق گردانی کی ۔ پھر بولا ۔ اتنا سود جائز ہے ۔ کھاتہ میں بھی لکھا ہے ۔

بنئے نے خوش ہو کر کہا ۔ میں تو بھگوان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا ۔ البتہ وہ جو گاؤں کا زمیندار ہے ، وہ بڑا ظالم ہے ۔ کسانوں کو بہت پریشان کرتا ہے ۔ زبردستی اناج ہتھیا لیتا ہے ۔

پرماتما نے بڑے پجاری کو حکم دیا ۔ زمیندار کے گھر چلو ۔

بنیا گڑگڑا کر کہنے لگا ۔ اور حضور وہ میری سہ منزلہ دھرمشالہ ....

زمیندار کے گھر مجرا ہو رہا تھا ۔ وہ بڑے تپاک سے ملا ۔

آیئے ۔ پرماتما جی ! یہاں اس کرسی پر بیٹھئے ۔ اس کرسی پر میرے قریب ۔ یہ دیکھیے میں نے جے پور سے نئی طوائف منگائی ہے ۔ اس کی کمر کا لوچ دیکھیے ۔ اس کا نرت ۔ ہائے ہائے ۔ بڑے دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ۔

میں بچپن میں ایک دوبار اپنی ماں کے ہمراہ مندر گیا تھا۔ (ہنس کر) آپ کی صُورت تو اب پہچانی بھی نہیں جاتی۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ مندر میں آپ کی نئی مُورت بنواؤں۔ لیکن کیا کروں، جنگ کی وجہ سے اخراجات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ . . . . بہرحال اگلے سال میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے سال ضرور آپ کی ایک نئی مورت مندر میں براجمان ہوگی۔

پرماتما نے کہا۔ ہم وہ پاسی کسان . . . .

ہیئے ہیئے، کیا ادا ہے! زمیندار نے ناچنے والی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پرماتما نے بڑے پجاری کی طرف گھور کر دیکھا۔ لیکن وہ بھی ناچ دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ ناچار پرماتما کو پھر کہنا پڑا۔

وہ اس پاسی کسان کے متعلق ہم . . . .

اجی آپ کس کمینے کی بات کر رہے ہیں، وہ تو سالہ بڑا بدمعاش ہے۔ وہ زمین دراصل میرے باپ کی تھی۔ دس بیگھے زمین جس میں وہ اب کاشت کرتا ہے میرے باپ نے خوش ہوکر اس کے نام کردی تھی۔ اور دیکھا جائے تو میرے باپ کو کیا حق تھا کہ موروثی جائداد ایک غریب کسان کے نام لکھ دیتا۔ یہ سراسر خلافِ قانون تھا۔ وہ تو یوں کہیے کہ میں ذرا آپ کا بھگت ہوں۔ میں صرف اپنا حصّہ لے لیتا ہوں اناج میں سے، صرف ایک تہائی لیتا ہوں۔ ورنہ دیکھا جائے تو وہ زمین ہماری ہے۔

پرماتما نے پجاری سے کہا۔ کھاتہ دیکھو!

ہیں؟ بڑا پجاری ابھی تک ناچنے والی کی طرف تک رہا تھا۔

پرماتما نے چڑ کر کہا۔ کھاتہ دیکھو۔ یہ زمین کس کی ہے۔

بڑے پجاری نے کھاتہ دیکھ بھال کر کہا۔ زمیندار سچ کہتا ہے۔ زمین کا مالک وہی ہے۔

زمیندار نے کہا۔ دیکھا بھگوان۔ آپ کا داس بھلا جھوٹ کاہے کو بولنے لگا۔ ارے آپ تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ذرا گانا سُنئے۔ ارے بھئی منو، ذرا بھاگ کر پان بنوالانا۔ وہ ذرا .... اِدھر نہ جایئے گا حضور۔ اُدھر پردہ ہے۔ ہاں یہ راستہ ہے۔ دراصل میں خود چاہتا ہوں کہ کسانوں کی مدد کروں۔ لیکن کیا کروں صاحب لگان اس قدر ہے، اس قدر ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ الایچی لیجیے۔ ذرا ریاست کے حاکم سے تو ملیے۔ اگر وہ لگان کچھ کم کردے تو ساری مشکل ابھی حل ہوجائے۔

.. .. ..

چپراسی نے کہا۔ آپ اس پرچے پر اپنا نام، پتہ اور کام لکھ دیجیے۔ صاحب اس وقت سر بھراٹا مکر چکر جی سے باتیں کر رہے ہیں۔

چپراسی پرچہ لے کر اندر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔ بولا۔ صاحب بولتے ہیں پانچ منٹ بیٹھو۔ وہ ابھی فارغ ہوتے ہیں۔ صاحب نے بڑے پجاری صاحب کو بھی سلام بولا ہے۔

پانچ منٹ کے بعد پیشی ہوئی۔

ریاست کے حاکم نے بڑی معذرت کی۔ دراصل سر بھراٹا مکر چکر جی سے ملاقات کا یہی وقت طے ہوا تھا، اس لیے انتظار کرنا پڑا۔ ورنہ .... معاف کر دیجیے گا۔ میں تو آپ کا اور اپنی رعایا کا خادم ہوں۔

پرماتما نے کہا۔ پیاسی کسان بھوکا ہے۔ آپ لگان بہت زیادہ لیتے ہیں۔ یہ بہت بُری بات ہے۔

دیکھیے دیکھیے۔ طیش میں نہ آیئے۔ حاکم نے نہایت نرمی سے کہا۔ مجھے ریاست کا نظم ونسق چلانا ہے۔ اس کے لیے روپیہ چاہیے۔ روپیہ کہاں سے آئے اگر میں کسانوں سے لگان وصول نہ کروں۔ آج کل کی اِرد گرد کی سب ریاستیں ہماری دُشمن ہو رہی ہیں۔ اس لیے اسلحہ جات کے کارخانوں کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا ہے۔ ان تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لیے لگان بڑھا دیا ہے۔

اس میں آخر پاسی کسان ہی کا فائدہ ہے۔ ورنہ اس کی یہ زمین، یہ دس بیگھے زمین دوسری ریاستوں کے قزاق چھین لیں گے۔

بڑا پجاری بولا۔ حاکم ٹھیک کہتے ہیں۔

حاکم بولا۔ میں تو ہر وقت آپ کے تابع ہوں۔ لیکن ذرا یہ سوچیے کہ کیا یہ میرا دھرم نہیں کہ میں اپنی ریاست کو دوسری دشمن ریاستوں کی دست و برد سے بچاؤں۔

بڑا پجاری بولا۔ حاکم ٹھیک کہتے ہیں!

∴ ∴ ∴

چوبے جی مندر کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ مندر کے چاروں طرف پھلدار درختوں کا باغ تھا۔ اور باغ سے ملحق پانچ ایکڑ زمین جس میں اناج سبزی ترکاری سب کچھ ہوتا تھا۔

پرماتما نے کہا۔ یہ اناج تم پاسی کسان کو دے دو۔

چوبے نے بھنگ کا لوٹا چڑھاتے ہوئے کہا۔ باؤلے ہوئے ہیں آپ۔ یہ اناج، یہ پھل پھلاری تو بھگوان کی بھینٹ ہے۔ اور جو چیز ایک دفعہ بھگوان کی بھینٹ ہو جائے اسے کوئی دوسرا آدمی کیسے کھا سکتا ہے۔ کیا آپ پرماتما ہو کر اتنا بھی نہیں جانتے؟

پرماتما نے بڑے پجاری کی طرف دیکھا اور بڑے پجاری نے پرماتما کی طرف۔ پھر بڑے پجاری نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ چوبے جی ٹھیک کہتے ہیں۔ کھاتے میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

∴ ∴ ∴

شام کو تھکے ہارے دونوں ساتھی پاسی کسان کے دروازے پر واپس پہنچ گئے۔ پاسی کے گھر کے اندر سے شیون کی صدا بلند تھی۔ چھوٹا لڑکا بھوک سے نڈھال ہو کر مر گیا تھا۔

اور کسان کی بیوی دوہتڑ چھاتی کوٹ رہی تھی۔

پاسی کسان نے پوچھا۔ اناج لائے؟

پرماتما نے سر جھکا لیا۔

بڑا پجاری بولا۔ صبر کرو پاسی کسان۔ صبر کے سوا اور کیا چارہ ہو سکتا ہے۔

ہائے میرا لال .... ہائے میرا ننھا موتی ....

یکایک پرماتما کا چہرہ مسرت سے روشن ہوگیا۔ اس نے سر اونچا کر کے کہا۔ پاسی کسان آؤ۔ ہم تمھیں اور تمھارے سارے کنبے کو سورگ لیے چلتے ہیں۔

پاسی کسان بولا۔ وہاں کھانے کو کیا ملے گا؟

پجاری نے کہا۔ وہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہاں صرف پرماتما کا نور ہے!

پاسی کسان نے تلخی سے کہا۔ پرماتما کا نور تو یہاں بھی ہے۔ اور یہ کہہ کر اس نے دروازہ زور سے بند کر لیا۔ اور پرماتما اور بڑا پجاری حیران و پریشان باہر کھڑے رہ گئے۔

جب وہ دونوں آسمانوں اور کائناتوں سے گزر کر اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ تو بڑے پجاری نے چپکے سے پرماتما کے کان میں کہا۔ دیکھا آپ نے۔ یہ کسان کتنے ناشکرے ہیں۔ سورگ میں بھی آنا نہیں چاہتے۔

پرماتما نے غضبناک لہجے میں کہا۔ دفع کرو، جہنم میں ڈالو سب کو!

بڑے پجاری نے مسکرا کر کہا۔ اس کا میں نے پہلے ہی سے بندوبست کر دیا ہے!

خوشی

وہ کہنے لگا ۔ نوکر تو نہیں البتہ ایک نوکرانی کا ضرور بندوبست کر سکتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آئندہ سٹہ میری معرفت کھیلا کریں۔

میں نے کہا ۔ تم تو مذاق کرتے ہو۔

وہ بولا ۔ جی نہیں ۔ مذاق اور آپ سے! سچ کہتا ہوں مجھے کمیشن ملتا ہے ۔ سٹے باز جو رقم داؤ پر لگاتے ہیں اس پر مجھے پانچ فیصدی کمیشن ملتا ہے ۔ اس دفتر کے سب ملازم میری معرفت ہی سٹہ کھیلتے ہیں ۔ ورنہ آپ ہی بتایئے کہ جو تنخواہ مجھے یہاں ملتی ہے اس میں کسی بھلے مانس کا گذارہ کیسے ہو سکتا ہے ۔

میں نے پوچھا ۔ اس کی عمر کتنی ۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ کے ۔۔۔۔ ؟ ۔۔۔۔ بیس برس کے بجرو نے مجھے بوکھلا دیا ۔

وہ مسکرا کر بولا ۔ جی نہیں ۔ کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی ۔ رنگ نہ گندمی نہ سانولا ۔ بس 'بیچ کا رنگ' جیسے فاختہ کے سینے کا ہوتا ہے ۔ بس آپ اسے ایک فاختہ ہی سمجھیے ۔

میں نے کہا ۔ میں شکاری نہیں ہوں ۔ مجھے تو نوکر چاہیئے ۔

وہ بولا ۔ وہ کھانا پکانا سینا پرونا سب جانتی ہے ۔ پھر آپ اکیلے ہیں ۔ وہ آپ

کے گھر کا سب کام سنبھالے گی۔
مگر بھئی نوکرانی! لوگ کیا کہیں گے۔
وہ ہنسا۔ آپ کی آزاد خیالی تو دفتر بھر میں مشہور ہے۔ اور آپ تو لوگوں کو اخلاق کا سبق دیتے ہیں اور اشتراکی بنا ناپسند کرتے ہیں۔ دیکھیے نا اگر اب آپ بھی ... ؟ اور پھر وہ بیچاری یتیم ہے۔
یتیم ہے؟ اس نے ترس کھاتے ہوئے پوچھا۔
جی اس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ اب تک اپنے چچا کے پاس تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو چچا نے اس پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔
تمہارا مطلب ہے اس کے دامن عصمت ۔۔۔
"جی ہاں اس کے دامن عصمت کو پارہ پارہ کرنا چاہا۔ اس کی زندگی کی متاع عزیز کو لوٹ لینا چاہا۔ اس کی دوشیزگی کی معصومیت کو اپنی رندی ہوسناکی کا شکار بنانا چاہا۔ اس کی باکرہ روح کی مقدس عفت کو اپنی بہمیت و شیطنت ...."
میں نے کہا۔ "اس بکواس کو بند کرو۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔
وہ بولا۔ جی۔ دیکھیے نا۔ لوگ سچائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ زنا بالجبر کہہ دینا گناہ عظیم ہے۔ دفتر کے بڑے بابو بھی کہتے ہیں۔ اور پھر میں مترجم ٹھہرا۔ جو وہ کہتے ہیں۔ اسی طرح کام کرتا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اس فعل شنیع اپنی زبان میں ادا کرنے کے لیے ایک سو ایک فقرے یاد کر رکھے ہیں۔ دفتر کے بڑے بابو کہتے ہیں کہ سچائی کو عریاں صورت میں کبھی پیش نہ کرنا چاہیے بلکہ ہمیشہ لباس پہنا کر۔
میں نے کہا۔ مگر ذکر تو نوکرانی کا ہوا تھا۔
وہ بولا۔ جی نہیں۔ ذکر اس کے چچا کا ہوا تھا جس نے اس پر ہات صاف یعنی میرا مطلب ہے ....
میں نے جلدی سے کہا۔ میں سمجھ گیا۔ آگے چلو۔
تو وہ اپنے چچا کے گھر سے بھاگ نکلی اور اپنی موسی کے گھر آگئی۔ یہاں پر موسی

نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی ۔ اسے اچھے کپڑے پہنائے ۔ دو چار اپنے زیور نکال کر اُسے دے دیئے ۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا ۔ اسے اپنے سینے سے لگایا ۔ کیوں جی جب عورت عورت کو سینے سے لگاتی ہے تو اس سے عریانی تو نہیں پیدا ہوتی؟

میں نے کہا ۔ معلوم ہوتا ہے بڑے بابو نے کسی غلط لفظ کے غلط ترجمے پر نہیں ڈانٹ پلائی ہے ۔ بہر حال ۔۔۔۔ خیر ۔۔۔۔ آگے بڑھو !

تو صاحب ۔ وہ بولا ۔ لڑکی بالکل نوجوان تھی ۔ اور اس کی موسی کا خاوند ذرا ۔۔۔۔ آں میرا مطلب ہے کہ ذرا وہ " تھا ۔ چنانچہ وہ " بھی لڑکی پر عاشق ہو گیا ۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ موسی کا خاوند اور موسی کا بیٹا دونوں اس پر عاشق ہو گئے ۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت ۔۔۔۔

پھر کیا ہوا ؟

ہوتا کیا ؟ موسی نے دو طمانچے لگا کر لڑکی کو گھر سے نکال دیا ۔ اب وہ اپنے پھوپھا کے گھر پہنچی ۔ پھوپھا ذرا شریف قسم کا بدمعاش تھا ۔ یعنی اسے بڑے دم دلاسے دے کر اپنے گھر رکھا ۔ اکیلا تھا وہ آپ کی طرح ۔ چنانچہ جہاں اور لوگ کامیاب نہ ہوئے وہ کامیاب ہو گیا ۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اس نے لڑکی کو پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا ۔

پیشہ کرنے پر ؟

جی ہاں ۔ آپ کو اس کا مطلب سمجھاؤں ۔ یعنی اُس لڑکی کو مجبور کر دیا کہ وہ چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض اپنی عصمت و عفت کو ، اپنی تقدس مآب حیا پرور دوشیزگی یعنی اس متاعِ عزیز ، خزینۂ حیات ۔۔۔۔"

خدا کے لیے ۔ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا مجھے تمھارے ترجمے سے کوئی سروکار نہیں ۔

وہ مسکرایا ۔ بولا مجھے شبہ ہے کہ آپ عریاں پسند ہوتے جاتے ہیں ۔ خیر ، مجھے آپ کی عریاں پسندی سے کیا سروکار ۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اس شریف بدمعاش پھوپھا نے اس بدقسمت لڑکی کو بازار کی فاحشہ بن جانے پر مجبور کر دیا ۔ چند ہفتے اسی

طرح گزرے۔ پھر وہ بیمار ہوگئی۔ سوزاک!

سوزاک؟ میں نے گھبرا کر کہا۔

وہ چڑکر بولا۔ آپ بدکتے کیوں ہیں۔ کس شہر میں۔ کس گلی میں۔ ہندوستان کے کس گاؤں میں آپ نے اس کا نام نہیں سُنا۔ زندگی کے کس نکڑ پر آپ نے اس منحوس بیماری کا نام نہیں سُنا۔ کیا کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے باز حملہ نہیں کرتا۔ کیا وہ اشتہار آپ نے نہیں دیکھے۔ "پیپ جلن دو دو دن میں بند" وہ کون مکان ہے۔ کون سا شہر ہے۔ کون سا گاؤں ہے۔ مندر سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک وہ کون سی دیوار ہے ....؟ جہاں اس خوفناک بیماری کی پیپ اور جلن کو دو دن میں بند کر دینے کا ذکر نہ ہو۔ وہ کون سا شریف گھر ہے ....؟

میں نے کہا۔ اب تم گالی دینے پر اُتر آئے ہو۔

چلیے نہ سہی۔ سوزاک نہ سہی۔ یہ سمجھ لیجیے۔ اسے ایک "خوفناک شرمناک بیماری" لاحق ہوگئی۔ گو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس لیے شرمناک کہا جائے۔ اس لڑکی کے لیے یا اُس شریف سماج کے لیے جو اس سے دن رات پیشہ کراتا ہے۔

میں نے کہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے یہ وعظ سُننا پڑے گا۔

وہ بولا۔ معاف کیجیے گا۔ واقعی میں بہت باتونی ہوں۔ جھکّی ہوں .... مختصر بیان کرتا ہوں .... تو صاحب اب وہ لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی۔ پھوپھا اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی چیخنے لگی۔ اتفاق سے میں سڑک پر گزر رہا تھا۔ اِدھر دفتر آتا تھا۔ بغل میں فائل والے ....،

ہیرو ہو گئے تم! میں نے طنزاً کہا۔

"جی نہیں" اس نے کہا۔ بھلا دفتر کا مترجم کبھی ہیرو ہو سکتا ہے۔ بھلا چالیس روپے تنخواہ پانے والا کبھی ہیرو ہو سکتا ہے؟.... ہاں تو صاحب میں اُسے اس کے پھوپھا سے چھڑا کر اپنے گھر لایا۔ یہاں میں اپنے بڑے بھائی اور بھابی اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچّوں میں رہتا ہوں۔ وہ لوگ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بھابی

نے میری شرافت کو سراہا اور اس لڑکی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ لیکن صاحب اس لڑکی کی قسمت ہی بُری ہے۔ میں اگر اس لڑکی سے دو باتیں بھی کر لوں تو بھابی خفا ہو جاتی ہیں اگر وہ لڑکی کبھی میرا بستر بھی ٹھیک کر دے تو آگ بگولہ ہو جاتی ہیں۔ اب گھر میں ہر وقت چیخ سی رہتی ہے۔ سکون تباہ ہو گیا ہے۔ لڑکی کے علاج پر میں نے چند روپے صرف کر دیئے۔ لیجیے اب تک گالیاں پڑ رہی ہیں۔ بھابی نے آج لڑکی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں اُس کا جی چاہے چلی جائے۔ میں اسے گھر پر نہیں رکھ سکتی۔

تو اس لیے تم اسے میرے ہاں بھیجنا چاہتے ہو۔ ایک بد معاش عورت کو میرے ہاں ملازم کرانا چاہتے ہو۔ میں نے غصّے سے کہا۔

اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ بولا مجھے آپ کے معصوم چہرے اور گنجے سر نے دھوکا دیا۔ میں سمجھتا تھا آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہے آپ محض باتیں ہی باتیں بناتے ہیں یا ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔

مگر وہ لڑکی؟ .... میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ بیمار ہے۔ اسے سوزاک ہے میں اسے کیسے؟ میں خود بیمار ہو جاؤں گا۔ تم سمجھتے نہیں .... یہ چھوت کی بیماری .... اور .... ذرا سوچو تو ....!

سُنیئے۔ اب وہ اچھی ہے۔ میں نے اتنی روپے صرف کیے ہیں اس کے علاج و معالجے پر۔ دیکھیے، آج بھابی اسے گھر سے نکال دیں گی۔ میں اُسے پھر قحبہ خانے کے جہنّم میں واپس نہیں بھیجنا چاہتا۔ اس کا اس دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اور میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے کہ میں اُسے ایک الگ مکان لے کر دوں۔

ایک الگ مکان؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔

وہ بولا۔ ہاں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

(۲)

چاند میرے گھر نوکرانی بن کر آ گئی۔

میں نے کہا۔ چاند

وہ بولی ۔ جی !

دیکھو میری عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ ہے ۔ میرا سر گنجا ہو چکا ہے ۔ میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں ۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ۔ میں عورتوں سے دور بھاگتا ہوں ۔ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہوں ۔ لوگ مجھے ازلی شریف سمجھتے ہیں ۔ میری شرافت میں بٹہ نہ لگانا ۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کرنا ۔ بال سنوار کر آنکھوں میں کاجل لگا کر مجھے دعوتِ نظارہ نہ دینا ۔ بس چپکے سے گھر کا کام کاج کرتی جاؤ ۔ پندرہ روپے تنخواہ اور روٹی کپڑا ۔

وہ بولی ۔ یہ دعوتِ نظارہ کیا ہوتا ہے جی !

میں ہنسا کہنے لگا ۔ کچھ نہیں ..... میں ذرا ترجمہ کر رہا تھا ۔ اب تم کچن میں جاکر برتن صاف کرو ۔ صبح مجھے دو انڈے نیم برشت اور ایک گلاس دودھ کا چاہیے ۔ دوپہر کو کھانا جس میں ٹماٹر اور کدو اور شلغم کبھی شامل نہ ہوں ۔ سہ پہر کی چائے میں دفتر ہی میں پیوں گا ۔ شام کے کھانے میں چاول ضرور ہونے چاہئیں ۔ سوتے وقت میرے گنجے سر میں روغن بادام کی مالش تمہیں کرنا ہوگی ۔ اس کے بعد تم اپنے کمرے میں سو سکتی ہو ۔ ہاں اندر سے زنجیر ضرور لگا لینا ۔ ورنہ میں ذمے دار نہیں ہوں ۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی ۔ چھوٹی سی لڑکی تو وہ تھی ۔ وہ عورت کہاں تھی ۔ ابھی تک نوجوانی کے سن میں بڑی مشکل سے آئی ہوگی ۔ لیکن اس کا جسم نہیں اس کی آنکھیں کہے دیتی تھیں کہ اس نے سب کچھ دیکھا ہے ۔ جہنم کے وہ شعلے جن کے متعلق ہمارے ہندوستانی شاعر کبھی شاعری نہیں کرتے ۔ سماج کے وہ گھناؤنے مناظر جس کا حسن ہمارے افسانہ نگار کبھی بے نقاب نہیں کرتے ۔ خرید و فروخت کے وہ ادارے جن کا ذکر ہمارے چیمبر آف کامرس میں کبھی نہیں ہوتا لیکن جو ہمارے پاک دور ہمارے ہندوستان کی ہر گلی میں ہر گاؤں میں پلے جاتے ہیں ۔ اس لڑکی نے اپنے جسم اور اپنی روح کے ہر سانس میں گھستے ہوئے ۔ اُسے اُجاڑتے ہوئے تباہ و برباد کرتے ہوئے ۔ اسے نوچ نوچ کر چیرتے پھاڑتے ہوئے ایک

بھوکے وحشی بھیڑیے کی طرح بھنبھوڑتے ہوئے دیکھے تھے۔اس کی آنکھیں ابھی تک زخمی تھیں۔اس کا نچلا لب اندر کو بھنچا ہوا تھا،کسی اذیت ناک کرب کی وجہ سے۔اور اس کا نچلا ہونٹ ذرا آگے کو جھکا ہوا تھا۔اور کسی مرد کو اپنے قریب آتے دیکھ کر تھرانے لگتا تھا،اور سینے کے خم کانپنے لگتے تھے۔

میں نے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔

"میاؤں"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔وہ کچن میں دال بگھار رہی تھی۔ پوچھنے لگی۔

"کیا ہے؟"

میں نے کہا۔"میں بلّی ہوں۔تم چوہا.... بلکہ چُوہیا ہی ہی ہی!!!"

وہ خاموش رہی۔میں شرمندہ ہوگیا اور اپنا گنجا سر کھجانے لگا۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے!

ایک دن کہنے لگی۔"میں دھوپ میں تمھارا کھانا لے کر آتی ہوں۔میرے پاؤں جلتے ہیں۔"

میں نے اس کے گندے،گرد و غبار میں اَٹے ہوئے پاؤں پر نظر ڈال کر کہا۔"ارے رے.... تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔"میں نے بازار سے اسے ایک جوتی خرید کر دی۔اور سفید دھوتیاں جن کے کنارے رنگین تھے۔اپنے گنجے سر کو چھپانے کے لیے ایک سمور کی ٹوپی لایا۔ایک سینٹ کی شیشی۔کریم اور اس کے لیے ہیر کلپ۔

جب بھی وہ نہ مُسکرائی۔

پورے ایک ماہ کے بعد میں نے اسے پندرہ روپے دیئے۔لو!یہ تمھارے ہیں۔انھیں تم جس طرح چاہو خرچ کرسکتی ہو۔

اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔اور پھر آنکھیں جُھکا کر روپے لے لیے۔میں نے دیکھا کہ وہ اور بھی زیادہ اداس ہوگئی ہے۔

چاند!میں نے کہا۔کیا بات ہے؟

جی کچھ نہیں۔

رات کو جب وہ میرے سر میں روغن بادام کی مالش کر رہی تھی، وہ کہنے لگی۔ کیا آج رات کو مجھے یہاں سونا ہوگا؟

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کیوں .... کیوں؟ .... کیا بات ہے؟ .... میں نے تم سے ....؟

وہ کہنے لگی۔ آج صبح آپ نے مجھے پندرہ روپے جو دیے تھے۔

میں کانپنے لگا۔

وہ بولی۔ پھوپھا مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستر پر سو جانے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ اور پھر مجھ سے سب روپے بھی چھین لیا کرتے تھے۔ آپ بھی اگر مجھ سے روپے چھیننا چاہیں تو ابھی واپس لے لو۔

میں نے کہا۔ تمہیں یہ شبہ کیسے پیدا ہوا؟

وہ بولی۔ تو آپ یہ روپے مجھ سے واپس نہ لیں گے؟

نہیں!

اور۔ اور مجھے .... (اشارہ کر کے) یہاں بھی نہ سُلائیں گے؟

نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تم کیوں اس طرح ....؟

وہ چپ چاپ اُٹھ کر چلی گئی۔ اس کی آنکھیں حیران تھیں۔

ایک دن وہ صحن میں بیٹھی شیشہ سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ایک گیت گا رہی تھی۔ کچھ عجیب سا گیت تھا۔ فحش بازاری۔ لیکن اس میں بھی عورت نے مرد کے خلاف اور سماج کے خلاف جو مرد کا سماج ہے، اپنے غم کو بیان کیا تھا۔ اک عجیب سا گیت تھا جس کے الفاظ اجازت نہیں دیتے کہ اسے یوں ادب کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اس گیت کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہے۔ یہ گیت تھا۔ ایک بازاری عورت کی گالی بھی تھی۔ جو اس نے مل کر مردوں کے خلاف بکی تھی۔ اور چاندا اسے آہستہ آہستہ سے نفرت کے احساس سے متاثر ہو کر گا رہی تھی۔ یہ گیت جو رات کے اندھیرے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گیت جو قحبہ خانے کی غلام فضا میں اُجاگر ہوا تھا۔ یہ گیت جو صدیوں کے ظلم و ستم، جبر و استبداد

کے خلاف عورت کی مسکی کچلی زخمی روح کا احتجاج تھا۔ ایک موٹی، مسلسل سی گالی، لیکن احتجاج کی روح تو پاک و صاف تھی۔ اس کا غم اور غصّہ تو شعلے کی طرح کندن تھا۔ گیت اچھا تھا۔ لیکن ماحول نے اسے ایک غلیظ سانس عطا کیا تھا۔ اس مفلس و نادار دوشیزہ کی طرح جو اپنی معصومیت کو گندے چیتھڑوں میں چھپائے ہو۔

چاند کیا گا رہی ہو۔

چاند کیا گا رہی ہو؟ میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ چپ ہوگئی۔

چاند!

وہ بولی۔ جی کچھ نہیں۔

چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اوپر کا لب اندر کو بھنچا ہوا تھا۔ اور نچلا لب ذرا آگے جھک کر کانپ رہا تھا۔ اور دانتوں کی لڑی بیچ میں جھلک رہی تھی۔ مجھے اس وقت وہ اس بے بس ہرنی کی طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے نااُمید ہو کر ایک کونے میں آکر کھڑی ہوگئی ہو۔ آخری مدافعت کے لیے۔

میں نے کہا۔ تمھیں معلوم ہے۔ "وہ" تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آج کل وہ تمھارے لیے بہت سٹّہ کھیلتا ہے۔ شاید اس کی قسمت پھر جائے اور وہ تمھارے لیے ایک گھر لے سکے۔

وہ کہنے لگی۔ پھوپھا کے ہاں ہر مرد یہی کہا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔

اور اُس نے آئینہ اُلٹا کر دیا اور کنگھی بھی زمین پر رکھ دی۔

(۳)

اس روز قیمے کے پراٹھے اور مرچوں کا اچار اور مکھن دستر خوان پر تھا اور ہم لوگ کھا رہے تھے۔ میں اور چاند اور وہ۔ چاند کی صحت اب پہلے سے بہت خراب تھی اور گالوں پر ہلکی سی سرخی آگئی تھی جیسے پکتے ہوئے آٹے کی۔ جلد ملائم پڑ گئی تھی۔ جسم گدرایا ہوا معلوم ہوتا

تھا۔ آنکھوں کی حزیں چمک بھی اس قدر اداس نہ تھی۔ پھر بھی لبوں پر مُسکراہٹ نہ آئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لڑکی اب کبھی مُسکرا نہیں سکتی۔ جیسے یہ لڑکی اب کبھی عورت نہیں بن سکتی۔ جیسے یہ چاند ہمیشہ کے لیے گہنا گیا ہے۔ جیسے اس روح کو کبھی قرار، سکون، اعتماد اور محبت عطا نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ زندگی کبھی خوشی، مسرت اور بہجت سے معمور نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ حیات اس مرمریں ٹھلیا کی طرح ہے جس میں لوگوں نے جا بجا سوراخ کر دیئے ہوں۔ اُدھر پانی ڈالو اِدھر غائب اس خالی گیت کو جو ایک تلخ گالی تھی اب کوئی خوشی سے معمور نہیں کر سکتا۔ وہ دسترخوان پر بیٹھی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر شریک کیا تھا۔ کیوں کہ وہ بھی موجود تھا۔ لیکن اسے اس کی خوشی نہ تھی۔ لیکن چاند کو اس عزت افزائی کا مطلق کوئی احساس نہ تھا۔ ہمارے ساتھ بیٹھنے کی خوشی نہ تھی۔ قیمے کے پراٹھے اور مکھن کی ڈلی اسے مرعوب نہ کر سکی۔ رنگین کنارے والی دھوتی اور اُونچی ایڑی کا سینڈل پہننے کی خوشی نہ تھی۔ وہ چُپ چاپ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اور ہم لوگ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے کام لے کر اسے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ بالکل ٹھس بیٹھی تھی۔ خاموش، اداس، پژمردہ۔ اور یکایک مجھے احساس ہوا کہ سماج کے عفریت کا گناہ عصمت دری سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اُس کی عصمت کے چھن جانے کا مجھے اتنا افسوس نہ تھا۔ ہر عورت کی عصمت ایک دن چھن جاتی ہے۔ اپنے خاوند کے ہاتھوں یا کسی غیر مرد کے ہاتھوں۔ افسوس تو یہ تھا کہ سماج نے اس چودہ برس کی لڑکی کی مُسکراہٹ چھین لی تھی۔ اس کا اعتماد چھین لیا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ہنسی چھین لی تھی۔ اور جب کسی انسان سے اس کی ہنسی چھین لی جائے تو اس سے بڑھ کر بدقسمت فرد اور کوئی نہیں ہو سکتا!

کھانا کھا کر اسے گہری نیند آئی۔ کہ جب آنکھ کھُلی تو چھ بجے تھے۔ سورج ابھی غروب نہ ہوا تھا۔ لیکن دھوپ بالکل ماند پڑ گئی تھی اور سائے گہرے ہو گئے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چل رہا تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھا۔ کیوں کہ سیتے بازوں کا دلال ابھی تک غلاف لپیٹے پر چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ سونے دو کم بخت کو۔ اسے کیا معلوم بہار کسے کہتے ہیں۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو شمال سے بادلوں کے پرے کے پرے صف باندھ کر چلے آ رہے تھے۔

میں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ آہا! آج بارش ہوگی۔ جب گنجے سر پر بارش کی پہلی بوندیں پڑتی ہیں تو روح کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے جو قیمے کے پراٹھے کھانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر یقین نہ آئے تو سر منڈا کر دیکھیے۔ اولوں سے بچیے لیکن بارش کی بوندوں کو اپنے سر پر برس جانے دیجیے تراوٹ حاصل ہوتی ہے اتنی خوشی ہوتی ہے۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور غسلخانے کی طرف جانے لگا۔ غسلخانے کے باہر پتھر کے چبوترے پر چاند بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں طشتری تھی اور طشتری میں آم کی کیری کے قتلے اور سُرخ مرچ اور نمک اور نیبو کے رس میں پڑے ہوئے قتلے وہ مجھے دیکھ کر ایک چور کی طرح جھینپی۔

میں نے کہا۔ مزیدار ہیں۔

بے حد۔ کھاؤ گے؟

میں نے سر ہلایا۔

اس نے ایک قتلہ مجھے دیا۔ وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ آہستہ سے کہنے لگی۔

میں نے پتھر مار کر اس پیڑ پر سے ان امبیوں کو توڑا ہے۔ بیحد مزیدار ہیں نا۔

ہوں .... ہوں .... میں نے کھاتے ہوئے کہا۔ کیسے چٹپٹے مزیدار ہیں!

یکایک وہ مسکرائی اور یہ مُسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کے سارے چہرے پر، سارے جسم پر، ساری فضا میں پھیلتی گئی۔

اس کا اُوپر کا ہونٹ جو اندر بھنچا ہوا تھا، آہستہ سے نرم پڑتا گیا اور اپنی اصلی حالت پر آتا گیا۔ اس کا غم پُرانا تھا۔ لیکن اس کی مُسکراہٹ پُرانی نہ تھی۔ نئی تھی۔ نوجوان تھی۔ خوب صُورت تھی۔ معصوم اور غیر ملوث تھی۔ اُس حیا پرور کلی کی طرح جو کھلنا چاہتی ہو۔ اور پھر شرما کر پردوں کی اوٹ میں چھپ جانا چاہتی ہو۔ لیکن اب یہ مُسکراہٹ کھُلتی گئی۔ گیت نے اپنا غلیظ لباس اُتار پھینکا اور اس کے جسم میں خوشی کا نغمہ بسنے لگا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

میں نے کہا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ ایک پتھر اور مارو اور امبیاں تو بڑی مزیدار ہیں۔

اُس نے پتھر ہاتھ میں اُٹھایا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

(۴)

یہ تم نے کیا کیا۔ اُسے اپنے گھر بھیج دیا؟

میں نے کہا۔ میں نے اپنی ماں جی کو لکھ دیا ہے کہ چاند میرے ایک عزیز دوست کی منگیتر ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ چاند کی دلجوئی کریں گی۔

لیکن وہ وہاں خوش رہ سکے گی؟

میں نے کہا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ وہاں اس سے کوئی عشق کرنے والا نہیں۔ چاند کو اب عشق کی ضرورت نہیں۔ اُسے رنگین دھوتیاں اور سینڈلوں کی بھی ضرورت نہیں۔ خوشی قیمے کے پراٹھوں میں بھی نہیں اور دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے میں بھی نہیں۔ اور اس ازراہِ ترحم شادی کرنے میں بھی نہیں۔ ان چیزوں سے اس کی مُسکراہٹ، اس کی خوشی لوٹ کر نہیں آسکتی۔

تم کیا کہہ رہے ہو۔

میں نے اس کی بات اَن سُنی کر کے کہا۔ میں گنجا ہوں اور تم اندھے فلسفی ہو۔ اور دُنیا ناپاک پھوپھاؤں سے بھری ہے۔ ذرا اسے میری ماں کی مامتا اور شفقت کی چھاؤں میں دم لینے دو۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم قہقہوں سے اپنے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ اسے ہنسنے دو اور اسے بھول جانے دو۔ اُسے ہنسنے دو۔ اور اسے بھول جانے دو...!!!

یکایک وہ سمجھ گیا۔ اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر گنجی چاند پر چپٹکی لے کر بولا۔

تم کورے جذباتی ہو۔ میرا شبہ درست نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تمھاری عقلیت کے پس پردہ خطرناک جذباتیت ہے۔ میرا شبہ درست نکلا... کون تھی وہ جس نے تمھیں یہ کربناک ثنویت عطا کی، جس نے تمھاری آنکھوں کا نور چھین لیا۔ جس نے تمھارے گھنے

بالوں کے جنگل اُجاڑ دیئے، جس نے تمھاری مُسکراہٹ میں یاس وقنوط کی تلخی جھلکا دی۔
کون تھی وہ ؟

میں نے کہا ۔زندگی ایک جُوا ہے۔ یہ بتاؤ آج سٹے میں کیا لگے ؟ نو سے دو یا پانچ سے سات ؟

٭

سپنوں کے اشارے

ایک دفعہ میں نے سپنا دیکھا کہ میں ایک چھوٹا سا بچہ ہوں اور گنا چوستے چوستے پریوں کے ملک میں آنکلا ہوں۔ پریوں کے ملک کو وہ راستہ جاتا ہے جو گھاس کے خوشوں کے نیچے سے ہو کر گزرتا ہے اور جہاں کھجوروں کے بڑے بڑے قدآور درخت ہیں اور جھاڑیوں کے جنگل جہاں چیونٹیوں نے بڑے پہاڑ بنائے ہیں، جہاں تیتریاں رنگا رنگ پھولوں کے مکانوں میں رہتی ہیں اور پریوں کے لیے شہد تیار کرتی ہیں۔ اس ملک میں کبھی رات نہیں ہوتی۔ کبھی دن نہیں ہوتا۔ دھوپ آسمانوں اور زمینوں سے چھن کر آتی ہے۔ اور اسی لیے بے حد صاف اور خوشبودار ہوتی ہے اور گھاس کے تنکوں پر پانی کی طرح بہتی ہے اور ندیاں بناتی ہوئی پرستان کو سیراب کرتی ہے۔ اس ملک میں کبھی بارش نہیں ہوتی، بادل کبھی نہیں گرجتے۔ بجلی کبھی نہیں چمکتی، برف کبھی نہیں پڑتی۔ سردی، گرمی، برسات کا پرستان میں کچھ پتہ نہیں۔ ہر وقت بہار کا سا عالم چھایا رہتا ہے۔ کہیں سے موتی لڑھکتے ہوئے آجاتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور اس طرح موتیوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ کبھی تو یہ موتی بالکل شفاف ہوتے ہیں اور کبھی مرمر کی طرح سپید اور ان کے آرپار کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ عرصے کے بعد سپید موتی شفاف موتی بن جاتے ہیں اور پھر گھاس کے

تنکوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور شفاف موتی دیر تک دھوپ کی ندی میں بہتے رہتے ہیں۔ اور پرستان کے بچے ان سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ان پر سوار ہوتے ہیں۔ اُنھیں کشتی بنا کر ندی میں سیر کرتے ہیں۔ انھیں بڑے بڑے کھمبوں کے نیچے لاکر باندھ دیتے ہیں اور خود آنکھ مچولی کھیلنے لگ جاتے ہیں۔ اور کناروں پر کھڑے ہوئے پھول اُن پرستانی بچوں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ اور شہد بنانے والی تیتریاں زعفران کی ڈنڈیوں پر جھولتی ہیں۔ اور پرستان کی فضا میں تعطر کی بارش کرتی ہیں۔ اور ہوا ایسی ہوتی ہے جس سے سارا پرستان ہر وقت جھولتا رہتا ہے۔ ایک ہلکے سے نغمے کی طرح، کیوں کہ پرستان میں ہوا نہیں ہوتی، راگنی ہوتی ہے اور نغمے کی لے ہی میں ہر پری سانس لیتی ہے، عجیب ملک ہے یہ پرستان!

جب میں گنتا چوستے چوستے پرستان پہنچا تو اک بچہ سا تھا۔ اس لیے کسی نے مجھ سے باز پرس نہ کی۔ میں ہر جگہ گھومتا رہا۔ تماشے دیکھتا رہا۔ موتی کی کشتیوں میں بیٹھ کر ندیاں پار کرتا رہا۔ کسی نے مجھ سے پاسپورٹ طلب نہ کیا۔ نہ محصول حاصل کیا، نہ گنتا ہی مجھ سے چھینا۔ صرف ایک پریزاد کو دیکھا کہ اداس اداس گھومتا تھا۔ اور ایک پھول کے دروازے سے دوسرے پھول کے دروازے میں جھانکتا تھا۔ اور کھمبوں اور جھاڑیوں کے جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ بڑا ہی خوبصورت پریزاد تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور تلووں میں چھالے تھے۔ اور جب وہ سانس لیتا تھا تو اس کے سانس کی لے میں سے آہ نکلتی تھی۔ پرستان کے لوگ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور چپ ہو جاتے اور خاموشی سے اسے راستہ دے دیتے تھے۔ میں کئی دن اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اکثر ان موتیوں کی کشتیوں میں آنے جانے والے مسافروں کو دیکھتا۔ نہایت غور سے جیسے کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر جنگلوں میں پھولوں کی جھونپڑیوں اور پتوں کی چھتریوں اور شاخوں کے تنا ور ستونوں کے پیچھے کسی کو ڈھونڈتا تھا۔ ہر بار اسے ناامیدی ہوتی اور وہ گھبرا کر اپنے گھر پلٹ آتا اور ستارے بنانے لگتا۔ ایک دن میں نے ایک

تیتری سے پوچھا۔ یہ پریزاد کیا ڈھونڈ تا ہے؟

تیتری مسکرائی۔ کہنے لگی۔ میری بنج رنگی ساڑھی تمھیں پسند آئی؟

میں نے کہا۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ تم کیا جواب دیتی ہو۔

تیتری نے پھول کے اندر زرد زرد نازک ڈنٹھلوں کا جھولا بنا رکھا تھا۔ وہ اس پر جا بیٹھی اور جھولے کے جھٹکے سے پھولوں کا زرد زرد غبار باری فضا میں پھیل گیا میں نے غصے سے کہا۔ "کیوں گرد اڑاتی ہو۔ بڑی بدتمیز ہو جی۔

وہ ہنسی۔ کہنے لگی۔ شہد کھاؤ گے؟

میں نے کہا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

اونہہ ہوں! اس نے انکار میں سر ہلایا اور پھول کی پتی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں حیرانی سے اس بند دروازے کی طرف تکنے لگا۔ اس پتی کے باہر شبنم کا ایک بڑا موتی لٹک رہا تھا۔ میں اس کے اندر جو جھانک کر دیکھتا ہوں تو ایک اور ہی دنیا پاتا ہوں زمرد کے جڑاؤ فرش پر ایک ایسی خوبصورت شہزادی ناچ کر رہی ہے کہ جس کے تبسم پر سارا پرستان نچھاور ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ناچ رہی تھی اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھے حیران دیکھ کر بولی۔ آؤ۔ ناچو گے؟

میں نے کہا۔ جی، مجھے ناچنا نہیں آتا۔

اچھا یہ کیا ہے؟ اس نے گنّے کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

یہ گنّا ہے۔ اس کا رس میٹھا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے کماد اور نیشکر بھی بولتے ہیں۔ اس کا گڑ بنتا ہے۔ کھانڈ اور شکر اور چینی۔ اور چینی آج کل راشن ہو گئی ہے۔

راشن؟

ہاں۔ مقررہ مقدار میں ملتی ہے۔

مقررہ مقدار؟

جی۔ جنگ کی وجہ سے۔

جنگ، وہ کیا ہوتی ہے؟

میں نے کہا۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔ مجھے بھی اس کی زیادہ سمجھ نہیں۔ ابا بتایا کرتے ہیں
ابّا ؟
جی ہاں ۔ ہر بچے کے ماں باپ ہوتے ہیں نا ؟
وہ سب لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنسیں ۔
شہزادی کہنے لگی ۔ تم بہت دلچسپ باتیں کرتے ہو ۔ کہاں سے آئے ہو ؟
زمین سے آیا ہوں !
وہ بولیں ۔ ہم بھی تو زمین پر رہتے ہیں ۔ کیا پرستان کے علاوہ یہاں کوئی اور ملک بھی ہے اس زمین پر ؟
اب ہنسنے کی میری باری تھی ۔ میں نے کہا ۔ آپ کو کچھ پتہ ہی نہیں ۔ اس پرستان کے علاوہ اس زمین پر اور بہتیرے ملک ہیں ۔ ہندوستان ہے ، انگلستان ہے ، امریکہ ہے ، جرمنی ہے ، جاپان ہے ۔ اور یہ ملک آپس میں لڑتے جھگڑتے ....
شہزادی بیچ میں سے بات کاٹ کر بولی ۔ یہ گنتا مجھے دو ۔
میں نے ہاتھ بڑھایا تو گنتا یکایک شبنم کے موتی سے جا ٹکرایا ۔ اور وہ ایک جھٹکے سے لاکھوں ذروں میں ٹوٹ گیا ۔ ٹوٹتے وقت مجھے شہزادی اور اس کی سہیلیوں کے قہقہوں کی گم ہوتی ہوئی آواز سنائی دی ۔ اور میں اپنی حرکت پر پشیمان وہیں کھڑا رہ گیا !

آگے چلا تو بہت دور جا کر مجھے ایک تیز رفتار ٹڈا دکھائی دیا جو اپنے کاندھے پر اسی پریزاد کو اٹھائے گاتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ میں نے پریزاد سے پوچھا ۔ کہاں جا رہے ہو ۔
کھمبوں کے جنگلوں میں ۔ ہٹو ۔ راستہ نہ روکو ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے اور شبنم کے موتی گم ہو جائیں گے ۔ گلاب کا جنگل تو میں نے سارا چھان مارا ۔ اب کھمبوں کا جنگل دیکھوں گا .... ہٹو بھئی ....
میں نے کہا ۔ بھلے مانس ! تم یہ ہر روز کسے تلاش کرتے ہو اور ناکام رہتے ہو ۔ اس پرستان میں میں نے صرف تمہیں اداس دیکھا ہے ۔

ٹڈے نے گایا۔ "عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم۔"

میں نے کہا۔ تو کیا پریزاد کو کسی سے عشق ہے؟

ٹڈا بولا۔ واہ تمھیں پتہ ہی نہیں؟

میں نے گنّا چوستے ہوئے کہا۔ بھئی میں پرستان میں نووارد ہوں۔ مجھے کیا معلوم۔ آج آیا ہوں۔ کل چلا جاؤں گا۔

پریزاد نے ٹڈے سے کہا۔ دیر ہو رہی ہے اور تمھیں باتیں بنانے کا بہت شوق ہے....

ٹڈے نے کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ آج دن بھر میں تمھارے ساتھ ہوں۔ ہم شہزادی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ تو تم شہزادی کو ڈھونڈ رہے ہو۔ ارے بھئی۔ ایک شہزادی تو میں نے ابھی ابھی دیکھی تھی۔ شبنم کے موتی میں زمرد کے فرش پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ وہ ادھر راستے میں ایک پھول کے دروازے پر....

پریزاد یہ سنتے ہی ٹڈے کے کاندھے سے اُتر کر بھاگا بھاگا اسی سمت گیا جدھر میں نے اشارہ کیا تھا۔ ٹڈے نے پریزاد کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ اور پھر اپنی ٹانگیں دھوپ کی ندی میں ڈال دیں اور مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ آؤ تمھیں اس بے چارے پریزاد کی کہانی سناؤں!

بہت اچھا! لو یہ گنّا۔

نہیں نہیں۔ میں ذرا زعفران کے ساتھ شہد ملا کر کھاتا ہوں۔ ڈاکٹر نے پرہیز کرنے کو کہا ہے۔

اچھا تو وہ کیا کہانی ہے؟

بہت لمبی کہانی نہیں۔ ایک چھوٹی سی داستان ہے۔ تمھیں یہ تو معلوم ہے کہ ستاروں سے آگے جہان اور بھی ہیں....

میں نے کہا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ ابّا نے...

ٹڈا بولا ۔ ہمارے ہاں ابا اماں نہیں ہوتے ۔ خیر، یہ الگ بات ہے ۔ ہاں تو سُنو۔
مگر۔ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ابا اماں نہیں ہوتے تو تمھاری پرورش کون کرتا ہے ۔ تمھیں پڑھنا لکھنا کون سکھاتا ہے ۔ تمھاری شادی بیاہ کون کرتا ہے اور بازار سے گنّا خرید کر کون دیتا ہے ۔ ارے بھئی .... !

ٹڈا بولا ۔ ہم زندگی کی طرح خودرو ہیں ۔ ہمارے ہر سانس کی لے میں علم رچا ہوا ہے ۔ یہی ہمیں سب کچھ بتا دیتا ہے ۔ ہمارے ہاں بازار نہیں ہے کیوں کہ کسی کو چیزیں خریدنے اور رکھنے اور ان پر قبضہ پانے کا شوق نہیں ہے ۔ یہ جنگل، یہ دھوپ، یہ شبنم کے موتی، یہ پھول کا شہد، یہ زمین کی زرخیزی سارے پرستان کے لیے کافی ہے ۔ کیا تمھارے ہاں زمین زرخیز نہیں ہے ۔

زرخیز تو ہے اور سب کے لیے کافی بھی ہو سکتی ہے مگر .... میں رُک گیا ۔

مگر کیا ؟

تم نہیں سمجھو گے ؟

ٹڈے نے کہا ۔ تم سچ کہتے ہو ۔ ہم تم دونوں دو مختلف دُنیاؤں میں رہتے ہیں ۔ تم ہماری بات نہیں سمجھ سکتے، ہم تمھاری بات کا اندازہ نہیں کر سکتے ۔ مگر جو کہانی میں تمھیں اب سُنانا چاہتا ہوں وہ دونوں دُنیاؤں میں مشترک ہے ۔ یہ محبت کی کہانی ہے !

محبّت ؟ میں نے کہا ۔ ہاں امّاں مجھے پیار کرتی ہیں ۔ میرا مُنہ چوم لیتی ہیں ۔ ابا مجھے اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں ۔ کبھی کبھی ایک پیسہ بھی دے دیتے ہیں ۔ یہی محبّت ہے نا ؟

ہاں یہی محبّت ہے ۔ لیکن محبت ایک اور طرح کی بھی ہوتی ہے ۔

وہ کیسی محبّت ہوتی ہے ؟

جیسے .... جیسے .... وہ میری طرف دیکھ کر مُسکرایا ۔

اوہ ۔ میں نے کہا ۔ تمھارا مطلب عشق سے ہے ؟

ٹڈا گھبرا گیا ۔ بولا ۔ تمھارے ہاں اس محبّت کو عشق کہتے ہیں ؟ عجیب بات ہے ۔

عشق ؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسی محبت نہیں ہوتی جسے عشق کہتے ہیں ہمارے ہاں محبت ہوتی ہے لیکن دکھ دینے والی نہیں۔ کسی پر قبضہ پاکر اسے محبوس رکھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ یہ بیماری صرف اس پریزاد کو ہوئی ہے۔ پہلے پہل اسے شہزادی سے صرف محبت تھی۔ شہزادی کو بھی اس پریزاد سے محبت تھی۔ دونوں خوش تھے۔ اور پرستان کی ہواؤں میں ناچتے پھرتے تھے۔ شہزادی ان سہیلیوں کے ساتھ اور پریزاد اپنے پریزادوں کی صحبت میں بھی رہتا تھا۔ اور کسی کو شکایت نہ تھی۔ گلہ نہ تھا۔ .... ٹڈا یکایک رک گیا۔

دو موتی کہیں سے لڑھکتے ہوئے آئے اور ندی کی سطح پر ناچنے لگے۔ ناچتے ناچتے الگ ہو گئے۔ اور پھر الگ ہو کر لڑھکنے لگے۔ پھر اکٹھے ہو کر ناچنے لگے۔ پھر دو تین موتی کہیں سے آئے۔ اب ندی کی سطح پر بہجت کا دلفریب رقص تھا۔ اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ دو موتی اب کہاں ہیں۔

ٹڈے نے کہا۔ یہی ہماری زندگی ہے۔ ہمارے ہاں محبت ہے غلامی نہیں۔ خوشی ہے عشق نہیں۔ ہم اکٹھے مل کر ناچتے ہیں پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک سے دو اور دو سے دائرہ بنا لیتے ہیں۔ اور اس دائرے میں سارے پرستان کو شریک کر لیتے ہیں لیکن پریزاد نے چاہا کہ وہ شہزادی کو سارے پرستان سے الگ کر دے۔ وہ صرف اس کی ہو کر رہ جائے۔ کسی سے بات نہ کرے، نہ ہنسے نہ ناچے نہ گائے۔ وہ دن بھر اس کی صورت تکتا رہتا۔ اور اس کے بشاش چہرے پر غم کی پرچھائیاں آ گئیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی گئیں اور سانس کی لے سے آہ نکلنے لگی....

پھر کیا ہوا ؟

شہزادی کو بھی پریزاد سے بے حد محبت تھی۔ لیکن اس محبت میں وہ غلامی کا پرتو نہ دیکھتی تھی۔ اپنی شخصیت کو، اپنی ذات کو، اپنی اَنا کو الگ دیکھتی تھی۔ اس نے پریزاد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ بہت کوشش کی۔ لیکن پریزاد کی محبت بڑھتی گئی، بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ پرستان کی فضا پر ایک کالا بادل بن کر منڈلانے لگی۔ پرستان کے سب لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ یا الٰہی اب کیا ہو گا !

پھر کیا ہوا؟

پھر یہ ہوا کہ شہزادی نے کھمبوں کے جنگل میں جاکر کھمبوں کے سب سے بڑے درخت کے گرد طواف کیا۔ اور اپنی سہیلیوں کو لے کر ناچنے لگی اور دُعا کی کہ وہ اسے اس قید سے بچا لے۔ کھمبوں کے سب سے بڑے درخت نے اس کی فریاد سُن لی اور اسے اپنے دامن میں پناہ دی۔

اب پریزاد مارا مارا پھرنے لگا شہزادی کی تلاش میں۔ اب پرستان کے لوگ اس پر ہنستے تھے۔ اب تو وہ ہنستے بھی نہیں۔ خیر جب شہزادی کہیں نہ ملی تو وہ بھی کھمبوں کے سب سے بڑے درخت کے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ تو درخت نے کہا کہ شہزادی کسی کی شخصی جائداد نہیں بن سکتی۔ اس لیے اسے سزا دی جاتی ہے اور شہزادی کو اس سے چھین لیا گیا ہے۔

اس پر پریزادہ بہت رویا۔ چیخا چلّایا اور اپنی سچّی محبت کی قسمیں دینے لگا۔

آخر درخت کا دل پسیجا اور اس نے بتایا کہ اس نے شہزادی کو شبنم کے ایک قطرے میں چھپا دیا ہے۔ جس دن پریزاد اس قطرے کو ڈھونڈھ لے گا، شہزادی اس کی ہو جائے گی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ....

بس اس دن سے پریزاد شہزادی کی تلاش میں شبنم کے قطروں میں جھانکتا پھرتا ہے۔ لیکن پرستان میں شبنم کے قطرے ان گنت ہیں اور ان کی زندگی بہت کم ہوتی ہے، وہ چمکتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔ اور شہزادی ایک شبنم کے قطرے سے دوسرے شبنم کے قطرے میں رقص کرتی جاتی ہے۔ اور کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں کہ شبنم کے قطرے اَن گنت ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس بوند، کس موتی میں پنہاں ہے۔ اور پریزاد صبح و مسا اسے تلاش کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی وہ کسی بچّے کو نظر آجاتی ہے جیسے تم نے ابھی اُسے دیکھا۔

اتنے میں پریزاد بھاگتا ہوا واپس آگیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھ سے کہنے لگا۔ وہاں تو ــــ نہیں ہے! ہائے اب میں کیا کروں! کہاں جاؤں۔ پھر ڈھونڈے

سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ چلو جلدی چلو۔ کھمبوں کے جنگل ہیں۔ ٹڈے نے اسے کاندھے پر سوار کرلیا۔ جب وہ چلنے لگا تو میں نے پریزاد سے پوچھا۔ تمھاری شہزادی کا نام کیا ہے؟

"حُسن!" اس نے آہ بھر کر کہا۔

اور تمھارا؟

"عشق!" اس نے سر جُھکا کر کہا۔ پھر بولا۔ تمھیں میرے نام سے کیا غرض ہے؟

کچھ نہیں۔ میں نے کہا۔ یونہی پوچھ لیا۔ لو یہ گنّا!

نہیں نہیں۔ پریزاد نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ مجھے گنّے سے کوئی رغبت نہیں۔ مجھے آگ پسند ہے۔

"گنّے کا رس آگ کو بجھا دیتا ہے!" میں نے مُسکرا کر کہا۔ "لو کھاؤ اِسے!"

یکایک ٹڈا قہقہہ مار کر ہنسا اور فضا میں جھن سے لاکھوں بُلبلے پیدا ہو گئے۔ اور جھن سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے گئے۔ اور آبشاروں کے گیت سے کان گنگ ہوتے گئے۔ اور دھوپ کی ندی اُوپر ہی اوپر چڑھتی گئی۔ اور آسمان کی چھت سے لگ کر فوارے کی طرح لاکھوں قطروں میں گرنے لگی۔ اور ہر قطرے میں شہزادی کا رقص تھا اور بارش کی پھوار تھی اور دھندلکا جو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر تاریکی اور تاریکی اور وہ ٹمٹماتے ہوئے جگنو اور دو گہری سبز آنکھیں جو گہری سبز ہوتی گئیں۔ اور پھر تاریکی میں گھل گئیں اور پھر کچھ نہ تھا۔ نہ تاریکی نہ روشنی، نہ احساس، نہ زمین نہ آسمان .... خلا! .... مکمل خلا ....!

(۲)

خلا اور نیم دھندلکا اور مدھم مدھم گھنٹیوں کا شور، جو بڑھتا بڑھتا ساری فضا پر چھا گیا۔ اور ساکت احساس پھر بیدار ہوتے گئے۔ اور نیم تاریک فضا میں منقش ستون نظر آئے۔ اور لوبان اور اگر کی خوشبو، اور ایک ہاتھ جو گھنٹی بجا رہا تھا اور دیوتا پتھر کا خاموش دیوتا سامنے تھا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ یہ میرا ہی ہاتھ تھا جو گھنٹی سے آواز کر رہا تھا۔ میں ایک پجاری براہمن تھا اور دھوتی پہنے ہوئے ماتھے پر تلک لگائے ہوئے اشلوک گنگنا رہا تھا۔ اور میری نگاہیں دیوتا سے بھی پرے،

مندر کی چھت سے بھی پرے آسمان کا سینہ چیر کر اُوپر بڑھتی چلی جارہی تھی، گھنٹیوں کے شور کے ساتھ۔

مجھے معلوم ہوا۔ میں بڑا پرہیز گار ہوں۔ دن رات سندھیا پوجا پاٹ کرنے والا ہوں۔ ایشور کا بھجن کرنے والا۔ چوبیس گھنٹے پرماتما کے دھیان میں مگن رہنے والا۔ میری ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ سر بھی گھٹا ہوا تھا۔ ہاں مُنڈے ہوئے سر کے بیچ میں گائے کے کھُر کی برابر ایک چوٹی تھی جس میں گرہ پڑی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں رام نام کا جالہ تھا اور اس جالے کے اندر ایک مالا تھی جس کے ہر منکے کو میں دن میں ایک ہزار ایک بار گھماتا تھا۔ مالا میں ایک سو ایک منکے تھے۔ دن میں چوبیس گھنٹے تھے، ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ تھے اور ایک سیکنڈ میں ایک بار رام نام! سوتے سوتے بھی میرا ہاتھ برابر مالا پھیرتا رہتا خود بخود مشین کی طرح اور سوتے ہوئے بھی میرے مُنہ سے رام نام کے گنگنانے کی آواز نکلتی اور میرا مُنہ ہر وقت آسمان کی طرف رہتا۔ ایسا احساس ہوتا کہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، ناچتے گاتے، ہنستے بولتے، گھنٹی بجاتے، پوجا پاٹ کرتے میری نگاہیں ہر وقت آسمان کی طرف لگی رہتیں۔

"بھگوان .... بھگوان .... تو کہاں ہے؟"

کسی نے مجھ سے کہا۔ اے مہرشی، میری بیوی بیمار ہے۔ اچھی ہو جائے گی؟

جو بھگوان کی اچھا!

مہرشی آج سٹے میں نو سے دو آجائے۔

جو بھگوان کی اچھا!

مہرشی۔ مجھ پر رشوت کا مقدمہ چل رہا ہے۔ مجھے بچا لیجئے۔

جو بھگوان کی اچھا!

براہمن دیوتا۔ میں نے ایک رشوت خور پر مقدمہ دائر کیا ہے۔ ملزم کو سزا دیجئے۔ میری محنت بر آئے بھگوان!

جو بھگوان کی اچھا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر کہا۔

میں ہر وقت آسمان کی طرف تاکتا رہتا اور اپنے بھگوان کے حضور میں پہنچنے کی کوشش کرتا۔ دل میں، جسم کے روئیں روئیں میں، روح کے ہر مسام میں، میں اُڑ کر بھگوان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا۔ وہ بھگوان جو مجھ سے اتنی دور، اس سُندر نیلے آکاش کے مرکز میں براجمان تھے..... میری آنکھیں بے اختیار اُوپر اُٹھ جاتیں۔ ہاتھ بھی بے اختیار دعائیہ انداز اختیار کر لیتے اور میرے لبوں سے صدا نکلتی..... اے بھگوان مجھے درشن دو۔ مجھے اپنے پاس بلا لو پرماتما!

ہر وقت یہ گمان ہوتا کہ میں اب اُڑا کہ اب اُڑا۔ لیکن پاؤں ابھی تک زمین کی گندی مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اور ہزار کوشش کے باوجود باہر نہیں نکل سکتے۔ اسی لیے تو میں اکثر بے تاب ہو جاتا تھا۔ اور بے چین ہو کر پھڑپھڑانے لگتا تھا۔ اور آخر ناکام ہو کر رہ جاتا تھا۔ کیوں کہ میری آنکھیں آسمان پر تھیں لیکن پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے اور میں اُڑ نہ سکتا تھا۔ اور اپنے پرماتما کے درشن سے محروم تھا۔ گو ریاضت کے نور سے میرا دل اور روح اسی طرح شاداب تھے جس طرح پانی کی فراوانی سے دھان کی کھیتی لہلہاتی ہے۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں ایک تمنا تھی۔ میرا پرماتما، میرا مالک مجھے مل جائے اور میری حسرت بھری نگاہیں ہمیشہ آسمان پر لگی رہتیں۔ اگر کسی طرح میں اُڑ کر آسمان کے اس مرکزی نقطے پر جا پہنچوں اور اپنے ایشور کے چرن پکڑ لوں تو کیا وہ میری روح کو دھتکار دیں گے، وہ روح جو اس ربِ عظیم کی شخصیت کا عنصر ہے۔

لیکن میں اڑوں کیسے؟

ہائے یہ اُونچا اونچا آسمان!

مندر میں، گھر میں، گلی میں، سڑک پر، بازار میں، دریا کے کنارے، کُنج میں، ہر جگہ ہر وقت کہیں نہ کہیں مجھے عورت نظر آجاتی تھی۔ لیکن کثرتِ ریاضت نے مجھے ابھی تک عورت سے بیگانہ بنا رکھا تھا۔ میں عورت کو ایک دیوی سمجھتا تھا جیسے مندر میں ایک دیوی ہوتی ہے۔ ایک ماں، جس کی خوبصورتی تقدیس کے جذبے کو بیدار

کرتی ہے، جس کی ماتا مجھے ہر بار بیٹا بن جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہ شفقت اور یہ تقدیس تو پرتو تھا اس خالق ارض و سما کی شخصیت کا کہ جس کے تقدس اور جس کی شفقت کا ایک حقیر سا حصہ عورت کے دل میں بھی اُتر آیا تھا۔

اور میں اپنی آنسوؤں بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے پیارے بھگوان کی طرف دیکھنے لگتا جو میری نظروں سے بہت دور، اپنے سماوی تخت پر بیٹھے تھے جہاں میں اُڑ کر پہنچنا چاہتا تھا۔

میں اپنی دُنیا میں، اپنی تلاش میں، اپنی کاوش میں اس قدر منہمک رہتا کہ عُمر کے پچیس برس گزر جانے پر بھی مجھے کسی عورت سے محبت کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ اسی لیے تو میں نے جوہی کی اداؤں کو نہ سمجھا۔ وہ جوہی جو سچ مُچ جوہی کی طرح سُندر تھی۔ وہ جوہی جو ہمیشہ سفید لباس پہن کر مندر میں آتی تھی۔ وہ جوہی جو مجھ سے سنسکرت کے اشلوک سُنتے سُنتے میری آنکھوں کی طرف تکتی رہتی، وہ جوہی جو ماتھا ٹیکتے وقت کتنے ہی عرصے تک اپنا سر میرے پاؤں سے لگائے رکھتی حتیٰ کہ میرے پاؤں جوہی کی آنکھوں کی شبنم سے دھوئے جاتے۔ وہ جوہی جو گھنٹوں مندر کی دیوار سے، دہلیز سے، ستون سے لگی کھڑی رہتی۔ اور نوجوان پجاری کو پوجا کرتے ہوئے دیکھتی، جو دُنیا و مافیہا سے بیخبر پوجا کرتا۔ اور ہاتھ اُوپر اُٹھا کر مندر کی بلند و بالا چھت سے بھی اوپر اس وسیع خلا کی طرف دیکھنا چاہتا جہاں اس کا پرماتما رہتا تھا۔ اور جوہی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی۔ اس کے طاقتور ننگے بازوؤں کی طرف دیکھتی اور پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھتی جو سرسراتی ہوئی ریشمین دھوتی رنگین کناروں اور سلوٹوں کے باہر اک کنول کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے۔

اور جوہی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

اور نوجوان پجاری جو میں تھا اُسے تسلّی دیتا اور کہتا۔ گھبراؤ نہیں جوہی تجھے پرماتما ضرور ملیں گے .... ہے بھگوان! تیری لیلا اپرم پار ہے!

اور پھر میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ جاتیں!

کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ یہ براہمن کوئی اور ہے، میں نہیں ہوں۔ میں ہوں اور نہیں ہوں۔ خود ہی تماشہ ہوں اور تماشائی بن کر محو تماشائی بھی ہوں۔ پھر ایک دن میں نے اس نوجوان پجاری کو یعنی اپنے آپ کو مندر کے دیوتاؤں کے قدموں پر زار و قطار روتے دیکھا۔ گڑگڑا کر دیدار کی خواہش کا اظہار کرتے دیکھا۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں بے ہوش ہوا جا رہا ہوں۔ مجھ میں ذرا بھی ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی میں دیوتا کے قدموں میں بے ہوش پڑا ہوں۔ روشنی کی ایک کرن پتھر کے دیوتا کے لبوں تک آئی اور یکایک سارا مندر جگمگا اٹھا۔ اور نور بھی پگھلتا گیا۔ اور خوش آنند نغموں نے مجھے اپنی لہروں پر اٹھا لیا۔ اور اچھال کر آسمان کی طرف پھینک دیا۔ آہا! اب میں اڑا جا رہا تھا۔ ہلکا پھلکا، بے وزن، اس نیلے آسمان کی فضاؤں میں اڑا جا رہا تھا۔ چاروں طرف نیلا آسمان تھا۔ بس اور کچھ نہ تھا۔ اوپر نیچے صرف نیلاہٹ۔ گہری، بالکل لا متناہی نیلاہٹ میں اوپر ہی اوپر اڑتا چلا گیا۔ پھر بھی یہ گہرائی ختم نہ ہوئی۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ میں اوپر اڑا چلا جا رہا ہوں یا اس نیلاہٹ کے نیچے دھنسا جا رہا ہوں۔ یہ آسمان ہے یا اندھا کنواں ہے جس میں نیلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں۔ دن، ہفتے سال گزرتے گئے اور میں اسی نیلاہٹ کے بھنور میں اڑتا رہا۔ جوں جوں اوپر، اور اوپر اڑنے کی کوشش کرتا، یہ نیلاہٹ گہری ہوتی جاتی۔ اور اگر نیچے آنے کی کوشش کرتا تو بالکل اپنے پاؤں تلے مکڑی کے لاکھوں جالے تنے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہ مکڑیاں مجھے زندہ کھا جائیں گی۔ اس لیے میں ان جالوں سے اوپر ہی اوپر اڑتا رہتا لیکن یہ جالے اب ہر وقت میرے پاؤں سے ذرا نیچے ہی رہتے۔ اور میں ہزار اوپر اڑنے کی کوشش کرتا، یہ جالے میرے پاؤں تلے ہی رہتے معلوم ہوتا کہ اب گرا کہ اب گرا۔ جوں جوں میں اوپر اڑتا یہ جالے بھی اوپر آتے گئے۔ اور میں وہاں چمگادڑ بن گیا۔ جیسے آسمان اور زمین دونوں نے جواب دے دیا تھا۔ نہ اوپر پہنچ سکتا تھا۔ نہ نیچے کی سمت جا سکتا تھا۔ اوپر نیلاہٹ کا بھنور تھا تو نیچے مکڑیاں۔ اور میں ایک حقیر سیارے کی طرح اس نظام شمسی میں گھوم رہا تھا آوارہ

بے مطلب جیسے میری زندگی کے یکلخت دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک بدنے بورنے والا، ایک طنز کرنے والا۔ دونوں کے دھڑ جُڑے ہوئے تھے جیسے جڑواں بچّوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں براہمن اب ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرتے رہتے۔ کیا دونوں براہمن تھے، یقین نہیں آتا۔ کیوں کہ ایک کی شکل تو اس قدر بُری تھی، اس قدر منحوس تھی، ڈراؤنی تھی کہ اسے دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے سخت گِھن آتی تھی۔ ایک راکشس تھا ایک براہمن۔ ایک شیطان، ایک یزدان۔ ایک جیکل ایک ہائیڈ۔ لیکن تھے دونوں ہیں۔ میں بھی دونوں میں تھا۔ یہ دونوں ہر وقت مباحثہ کرتے رہتے۔ تو تو میں میں کرتے۔ گالی گلوچ کرتے۔ گتھم گتھا ہو جاتے۔ ایک دوسرے پر الزام دھرتے کہ اس مسئلے کی وجہ سے میں اس حالت کو پہنچا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر بھنور سے نجات حاصل کرنا ہے تو یہی بہتر ہے کہ مکڑی کے جالے میں پھنس جاؤں۔ شاید اس جال کو توڑ کر زمین کی طرف قدم بڑھائیں اور زمین کی کشش اپنی طرف کھینچ لے۔ بھنور سے نکلنے کا یہی صحیح طریقہ ہے کہ آدمی بھنور کے مرکز میں سب سے نیچے چلا جائے اور پھر بھنور کو اپنے گرد گھومنے دے۔ بھنور ایک عرصے کے بعد اس آدمی کو نشیب سے بلندی پر لے آئے گا۔ لیکن یہاں تو بلندی میسر تھی۔ پستی کی حاجت تھی۔ اور دونوں براہمن لڑ رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب میں نے یعنی ہم دونوں نے لڑتے جھگڑتے ہوئے نیچے غوطہ لگایا تو میں زیادہ پر امید نہ تھا۔ پاؤں جھن سے مکڑی کے جالے سے ٹکرائے اور پھسل کر نیچے گرتے گئے۔ اب میں پیپل کے اونچے درخت کی پھنگوں پر سے گزر رہا تھا ایک کوّا مجھے دیکھ دیکھ کر زور زور سے قہقہہ لگانے لگا۔ مجھے یعنی کہ ہم دونوں کو۔ پھر میں نے دیکھا کہ میری روح کے دونوں حصّے وہیں ہوا میں پیپل کی شاخوں کے اوپر معلق ہیں۔ اور میں مندر کے قریب گلی میں کھڑا ہوں۔ اتنے میں جوہی آئی اور میرے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے پوچھا تم کیا چاہتی ہو۔ وہ پیپل کے پیڑ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ وہ دونوں براہمن کب تک معلق رہیں گے۔ میں جواب دونوں سے الگ تھا، اور شاید نہیں بھی تھا۔ کیوں کہ وہ دونوں

بھی مجھے اپنا آپا ہی معلوم ہوتے تھے ۔اب ان دونوں سے استفسار کرنے گیا ۔

میں نے پوچھا ۔تم کیا چاہتے ہو ؟

ایک نے کہا ۔ زمین پر اُترنا چاہتے ہیں ۔

دوسرے نے کہا ۔غلط ہے ۔ مجھے بول براز چاہیے ۔ ہا ہا ہا !

پہلے نے کہا ۔خدا کے لیے ۔

دوسرا بولا ۔شیطان کے لیے ۔

میں نے کہا ۔ اب کیا ہوگا ۔

دوسرے نے کہا ۔میں بھوکا ہوں ۔میں بھوکا ہوں ۔مجھے بول براز چاہیے ۔میں بھوکا ہوں ۔اور یہ کہہ کر اس نے پہلے کو کھانا شروع کیا ۔ اور پہلا چلاّنے لگا ۔مجھے بچاؤ ۔ مجھے زمین پر آنے دو ....

میں بھاگا بھاگا جوہی کے پاس گیا اور اس کے پاؤں کی خاک چٹکی میں اور پیپل کی آخری پھنگ پر پہنچ کر ان دونوں پر جھڑک دی ۔یکایک مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور پیپل کے درخت کی سب شاخیں ٹوٹتی گئیں اور میں دھم سے زمین پر آگرا ۔فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا ۔اور وہ دونوں ایک ہوتے ہوئے معلوم ہوئے جیسے ایک سانپ نے دوسرے سانپ کو کھا لیا ہو ۔ نہ معلوم شیطان نے یزداں کو ہڑپ کر لیا تھا یا براہمن نے راکشس کو ۔مگر میں نے ان دونوں کو اور اپنے آپ کو ایک عجیب وغریب طریقے سے شیر وشکر کی طرح ایک ہوتے ہوئے محسوس کیا ۔جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا ۔اور مندر کی چار دیواری تھی اور میں زمین پر اندھا پڑا تھا ۔اور جوہی میرے پاس تھی ۔

یکایک وہ براہمن جو میں تھا اُٹھ بیٹھا ۔اور جوہی سے پوچھنے لگا ۔تم کون ہو !

میں ایک بیوہ ہوں ۔ جوہی نے کہا ۔

جوہی نے کہا ۔ میں بیوہ ہوں ۔تم دیوتا ہو ۔میں گناہ گار ہوں ۔تم براہمن ہو ۔ مجھے خوشی نہ دو ۔غم دے دو ۔

براہمن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ۔آؤ باہر چلیں ۔اب یہ گھر ویران ہو گیا ہے ۔

اس مندر میں اب کوئی نہیں ہے ..... ٹھیرو ۔ اپنے قدموں کی خاک مجھے دو ۔ یہ خاک بدی کو نیکی میں مبدل کرتی ہے .....!

اور وہ چلنے لگے ۔ اور مندر بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا گیا ۔ اور دیوتا کے لبوں پر روشنی کی کرن پھیلتی گئی اور مندر وسیع ہوتا گیا ۔ اور ان کے ساتھ چلتا گیا ۔ اور صحن وسیع ہوتے ہوتے لہلہاتے بلیے سیدھے کھیت بن گئے اور ان میں گندم کے سنہری پودے لہلہا رہے تھے ۔ دیوتا نے پھر سفید آسمان کی طرف دیکھا اور اسے ایک مرتبہ پھر محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں پھر فرش زمین سے اُٹھ رہے ہیں ۔ اُس نے گھبرا کر پھر جوہی کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اب وہ پھر زمین پر تھا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے شانہ بشانہ چلے گئے افق سے پرے ..... افق سے پرے ..... افق سے پرے ..... !!!

(۳)

میں خواب و خیال کی وادی سے گزر کر فہم و ادراک کی دُنیا میں واپس آرہا تھا کہ راستے میں خضر مل گئے ۔

بولے ۔ کیا سمجھے ؟

میں نے اس بچے کی طرح جسے نیا سبق ملا ہو رُکتے رُکتے کہا ۔ یہی کہ پرستان اسی دُنیا میں ہے ۔ اور ..... خُدا بھی اسی دُنیا میں ہے ۔ اور آسمان کی طرف بار بار تاکنا گُناہ ہے !

شاباش ! انھوں نے تھپکی دے کر کہا ۔ اور عشق ؟

میں نے کہا ۔ محبت میں غلامی نہیں ہوتی ، بیوگی نہیں ہوتی ، موت نہیں ہوتی اور جب کوئی محبت کو غلام یا بیوہ یا مُردہ بنانے کا خیال کرتا ہے تو حُسن اس دُنیا میں تو کیا ، پرستان میں بھی نہیں رہتا اور شبنم کے قطروں میں چھپ جاتا ہے ۔

شاباش ! یہ کہہ کر وہ راستے سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے ۔ بولے اب تم جا سکتے ہو۔ لیکن میں چلتے چلتے رک گیا ۔ ذہن میں ایک سوال آگیا ۔ پوچھ لیا ۔ مگر ایک مشکل

تو حل کیجیے - میری سمجھ میں یہ نہیں آتا - کہ ان تمام باتوں کے باوجود پریزاد کی تلاش کیوں جاری ہے اب تک -؟

وہ ہنسے - کہنے لگے - "اچھا ہے کہ تم عشق کی ماہئیت سے غافل ہو رہو- جس دن تم اسے سمجھ لو گے، اس کے بعد تمھیں زندہ رہنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی -

٭

جگن ناتھ

"وہ" علی گڑھ کے مضبوط، سیاہ رنگ کے آہنی ٹرنک آپ نے بھی اکثر دیکھے بلکہ خریدے ہوں گے جن کی پشت پر "کارخانہ جگن ناتھ کھتری" لکھا ہوتا ہے۔ اور اس ٹھپے کے گرد ایک سفید دائرہ کھنچا ہوتا ہے۔ "دیکھے ہیں نا آپ نے"؟ بس سمجھیے ٹرنکوں میں یہی اصلی مال ہے اور اس سے بڑھیا آہنی صندوق صرف گاڈریج والے بناتے ہیں۔ ورنہ ہندوستان میں کوئی خانہ لالہ جگن ناتھ کھتری کے کارخانے کا مقابلہ نہیں کرسکتا .... ہاں بھوت ناتھ تیل کی بات الگ ہے۔ لیکن اس وقت تو میں خوشبودار تیل نہیں، آہنی صندوق کا ذکر کررہا ہوں۔ سمجھے آپ! علی گڑھ دو چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ ایک تو مسلم یونیورسٹی اور دوسرے رام آپ کا بھلا کرے .... یہی لالہ جگن ناتھ کھتری کا کارخانہ بہترین ٹرنک ساز میرے کارخانے میں کام کرتے ہیں .....

لالہ جگن ناتھ کھتری اسی طرح، اسی انداز میں، اپنی نشست پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو درست کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو اپنی سفید دھوتی کی تہوں میں چھپاتے ہوئے، ریل گاڑی کے ڈبے سے باہر دیکھتے ہوئے باتیں کرتے جاتے ہیں۔ یہ ان کی بہت پرانی عادت ہے۔ کہتے ہیں میں اپنی کمپنی کا چلتا پھرتا اشتہار کیوں نہ بنوں۔ لوگ ریل گاڑی میں ہزاروں روپے صرف

کر کے اشتہار دیتے ہیں۔ ہم ایک پیسہ صرف کیے بغیر اپنے کارخانے کا اشتہار دے رہے ہیں۔ کیا بُرا ہے؟ اب یہ دیکھو ریلوے والے خود اپنی ریل کا اشتہار نہیں دیتے۔ دیکھ لو۔ پڑھ لو۔

مُسافروں کی نظریں ایک بڑے پوسٹر پر جم گئیں جو ڈبے کے اندر اک لکڑی کے چوکھٹے میں لگا تھا۔ جگن ناتھ کے معروف مندر کی تصویر تھی جو پوری میں واقع ہے اور جس کی زیارت کے لیے لاکھوں ہندو ہر سال جاتے ہیں۔ جگن ناتھ کی تعریف سارے ہندوستان میں گائی جاتی ہے۔ کیوں کہ جگن ناتھ دیوتا کے دونوں ہات پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔ مورتی میں اور تصویر میں بھی ہمیشہ اسی طرح دکھایا جاتا ہے۔ اسی دیوتا کے عظیم الشان مندر کی تصویر تھی جو پوری میں واقع ہے۔ اور نیچے جلی حروف میں لکھا تھا "ہندوستان کی سیر کیجیے" دیکھا آپ نے۔ لالہ جگن ناتھ کھتری بول اُٹھے۔ ریلوے پوری میں بھگوان جگن ناتھ کے مندر کی تصویر لوگوں کو دکھا رہی ہے تاکہ لوگ جوق در جوق ریل پر سفر کر کے پوری جائیں۔ ورنہ ریل کوئی ہندو تھوڑے ہی ہے۔ ہے ہے ہے!

لالہ جگن ناتھ کھتری اپنے پیلے دانت نکال کر ہنسے۔ اور مجھے ان کے مُنہ سے اک عجیب قسم کی غلیظ بساند، کچاند، بھکراند آئی۔ ایسی کراہیت آمیز ہنسی تھی ان کی۔ معلوم ہوا سارے ڈبے میں کسی نے گندگی اچھال دی۔ بوٹی لاڈر کا کوئی نسخہ اس خبیث مُنہ کے لیے کارآمد ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بدبو جسم سے نہیں روح کے ذرّے ذرّے سے پھُوٹ رہی ہے۔ میں رشتے میں ان کا بھانجا ہوں۔ خیر۔۔۔۔!

لالہ جگن ناتھ کا قد ناٹا اور جسم موٹا ہے۔ ان کے چہرے کا رنگ ان کے کارخانے کے تیار کردہ ٹرنکوں کی طرح سیاہ ہے۔ لالہ جی کی کھال بھی آہنی چادروں کی طرح مضبوط اور گٹھیلی معلوم ہوتی ہے۔ سنا ہے جوانی میں بہت کثرت کرتے تھے۔ لیکن اب باتیں بہت کرتے ہیں۔ گو سر اب بھی گھٹا ہوا ہے اور چٹیا کے بال چھدرے ہوتے جا رہے ہیں اور مونچھیں بھی سپید ملگجی سی۔۔۔۔ چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کسی نے سیاہ ٹرنک میں سفید تالا لگا دیا ہو۔ لیکن لالہ جی کے مُنہ کا تالا قریبًا قریبًا ہر وقت کھُلا رہتا ہے وہ ہر وقت باتیں کرتے رہتے ہیں۔ باتیں نہ کریں تو رال ٹپکاتے رہتے ہیں۔ رال نہ

ٹپکائیں تو کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے جس دن وہ بات نہ کریں گے، وہ دن
اُن کی موت کے بعد آئے گا۔ ایشور نہ کرے وہ کبھی مریں۔ میں تو ان کے کارخانے میں
جنرل منیجر ہوں۔ پھر اُن کا بھانجا ہوں۔ ان کے قدم کی برکت سے یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے
اور لاکھوں روپے کا ہیر پھیر دن بھر میں ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اسے بھی اشتہار تو متصور نہیں
کر رہے۔ میرا مطلب ہے ....!

لالہ جگن ناتھ اپنے ایک مسافر ساتھی سے بات چیت کی راہ نکالتے ہوئے بولے
یہ میرا بھانجا ہے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ صاحب دن بھر سوٹ ڈالے بیٹھے رہتا
ہے۔ میں اسے کچھ کہتا نہیں ہوں۔ کیوں کہ ابھی جوان ہے۔ پہلے صاحب یہ سُنا ہے
کہانیاں لکھتا تھا۔ آج کل ٹرنک بیچتا ہے۔ اس لیے میں ذرا اسے ڈھیل دیتا ہوں تاکہ
کام سیکھ جائے اور کہانیاں لکھنا بھول جائے۔ صاحب انگریزوں نے تو ہمارے
لونڈوں کا بالکل ستیاناس کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں کون کہانی پھسانا
لکھتا تھا۔ ایک یوگی تلسی داس کی رامائن، سو وہ تو پُرانا اتہاس ہے۔ اب یہ نئے چرکٹے
کیا لکھیں گے جی، میں ذرا لکھنؤ لیے جا رہا ہوں اسے تاکہ بزنس کے کچھ اور چھور سے اسے
پتہ چلے تو کہیں ٹھکانے سے کام کرے۔ اخوہ یہ گاڑی تو بہت تیز جا رہی ہے۔ طوفان میل
ہے نا۔ مگر صاحب آج کل تو ڈرائیور ذرا آرام سے گاڑی چلائے تو اچھا ہے۔

کیوں؟ ایک مسافر بولا۔ جس نے اپنا نام رام دلارے بتایا تھا۔ راجستھان کا
رہنے والا تھا۔ کلکتے میں بینکر تھا۔ جب وہاں بم پڑے تو بھاگ کر دہلی چلا آیا۔ اب اپنے
کسی کام سے لکھنؤ جا رہا تھا۔ دونوں کلّوں میں پان داب رکھے تھے۔ یہ اس لیے کہ یہ دونوں
کلّے اندر کی طرف دبے ہوئے تھے۔ اگر مُنہ میں دونوں طرف پان داب کر رخساروں کو
ویٹر نہ بناتا تو بالکل کسی بُڈھے جھڑوس کے سے دکھائی دیتے۔ یہ کلّے، پھر یہ پان جو
ہر وقت مُنہ میں دابے رہتا تھا، اس سے کلّے بڑے بڑے اور بھرے بھرے
دکھائی دیتے تھے۔

"رام دُلارے جی،" جگن ناتھ کھتری ران کُھجاتے کُھجاتے بولا۔ اس کانگریس نے

لٹیا ڈبو دی۔ اس جنگ کے زمانے میں جبکہ دشمن سر پر چڑھا آ رہا ہے، گھر میں لڑائی کا سماں باندھ کے رکھ دیا۔ کہتے ہیں کانگرس کے لیے بھی آزادی دو۔ سورج۔ ہونہہ! صاحب ہمیں تو آج کل دنا دن ٹھیکے مل رہے ہیں۔ اور یہ لوگ سرکار سے لڑنے کی ٹھان رہے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں جو لوگ سرکار کو دق کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔

"جیل میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔" مولوی کرم علی نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔
لیکن مولوی جی۔ کانگرس تو اب جیل میں ہے۔ اب بدمعاش لوگوں نے ریلیں اُکھاڑنا شروع کر دی ہیں۔

"ہاں" رام دلارے نے گھبرا کر پوچھا۔
جی صاحب۔ کیا مجھے جگناتھ کھتری سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ اس لائن پر بھی کئی بار حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ایک اور مسافر نے گھبرا کر پوچھا۔ "اب لکھنؤ کتنی دور ہے؟"
ابھی تو چار سٹیشن باقی ہیں۔ پہلے او کھلا آئے گا۔ پھر سندیلہ، پھر بیجی پور کا گاؤں پھر بینا نگر پھر لکھنؤ۔

"ہائے لکھنؤ!" ایک لکھنوی چیخا۔
علی گڑھ۔ بس علی گڑھ۔ ہائے وہ نرس روڈ۔ دُنیا میں اگر کوئی مقام ہے تو وہ علی گڑھ علی گڑھ کی دو چیزیں مشہور ہیں۔

مگر جگن ناتھ کھتری کی بات اس پنجابی نے ختم نہ ہونے دی جو ایک کونے میں ٹانگیں پھیلائے تین آدمیوں کی جگہ گھیرے بیٹھے تھا۔ وہ وہیں سے دہاڑا۔ ہائے لاہور! میں قربان .... لاہور بس لاہور ہے" ایک کیڑا کھڑکی کے شیشے پر تیزی سے چلتا ہوا ایک درز میں گھس گیا۔ درز میں گھس کر اس نے اپنا چھوٹا سا مُنہ باہر نکالا اور ڈبے کے مسافروں کو گھور کر کہنے لگا۔ بکتے ہو تم سب۔ یہ درز جس میں میں رہتا ہوں، دنیا کا حسین ترین مقام ہے۔

رام دُلارے نے کھڑکی کا شیشہ اُوپر چڑھا دیا۔ درز کہیں غائب ہو گئی۔ مولوی کرم علی

نے کھانس کر کہا۔ کچھ بھی ہو ہندوستان کا مسلمان اس تحریک سے الگ ہے۔ وہ اس تحریک پر تین حرف بھیجتا ہے۔ یہ ہندو کی چالاکی ہے۔ حکومت کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔
مگر مولوی صاحب ملک بھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ مشین گنیں چل رہی ہیں۔ بہار میں ہوائی جہازوں کے ذریعے کالوں کے مجمع کو تتر بتر کیا جا رہا ہے آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔
"آزادی پسندوں کو اس وقت انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔" ایک کھدر پوش سگار پیتے ہوئے بولا۔ "ملک کو اس وقت آزادی کی ضرورت اس قدر نہیں جتنی فسطائیت کا مقابلہ کرنے کی۔ ہمارے ملک کے رہنماؤں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔ نتیجہ آخری بمباری، قتل و غارت۔ اور دشمن سر پر ہے۔ یہ کیا حماقت ہے!"
جب کھدر پوش سگار اپنی باتیں ختم کر چکا تو کھدر پوش پائپ جو اس کے قریب بیٹھا تھا کہنے لگا۔ سچ کہتے ہو۔ یہ عوام کی جنگ ہے۔ سارے ہندوستان کی جنگ ہے۔ اس وقت ہمیں فسطائیت کا مقابلہ کرنا ہے۔

آزادی پسند احمق ہیں۔
کھدر پوش سگار بولا۔ میں تو کہوں گا وہ غدار ہیں۔
جگن ناتھ کھتری بولے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دیکھیے اس جنگ سے ہندوستان کے کارخانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے۔ میرے کارخانے میں اب پہلے سے سہ گنا مال تیار ہوتا ہے۔ اب تو دساور بھی جاتا ہے۔ میرے کارخانے کا مال، سفید ٹھپہ لگا ہوتا ہے میرے ٹرنک پر۔ ارے یہ ٹرنک تو میرے کارخانے ہی کا ہے۔ یہ لو باتوں باتوں میں سندیلہ بھی گزر گیا۔ اب شاید نبجی پور آئے گا۔ کیوں ہے ...... وہ لالہ جی میری پسلیوں میں چٹکی لے کر بولے۔ پھر مولوی کرم علی سے کہنے لگے۔ نبجی پور میں میرے اس بھانجے کا گھر ہے۔ وہیں اس کے ماں باپ بھائی بہن رہتے ہیں۔ وہیں اس کی "وہ" بھی رہتی ہے جس سے یہ پریم کرتا ہے۔ ہے ہے ہے .... وہ ہنسے۔
اے خدا اگر تو ہر جگہ ہے تو اس ڈبے میں فنائیل کی بوتل بن جا۔

مولوی کرم علی نے اپنی جیب سے رومال نکالتے ہوئے کہا۔ نیجی پور بڑا خوبصورت گاؤں ہے۔

آپ کو بھی پسند ہے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

مولوی کرم علی نے کہا۔ وہاں ہماری قربت داری ہے، سیدوں کے گھر۔

میرا بھانجا پہلے پھسانے لکھتا تھا مولوی جی۔ جگناتھ کھتری نے مولوی جی کو مرعوب کرنے کے لیے کہا۔ کانگرس میں کام کرتا تھا۔ کبت بناتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے کام پر لگایا ہے۔

کانگرس پر تین حرف! کھدر پوش پائپ بولا۔ ریڈیکل پارٹی زندہ باد!

سگار نے جل کر کہا۔ سالے۔ گورنمنٹ کا روپیہ کھاتے ہو۔ تیرہ ہزار تم کو ہر ماہ ملتا ہے۔ کس منہ سے تم آزادی پسندوں کو گالی دیتے ہو۔

سوشلزم بالکل فراڈ ہے۔ مولوی نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ اسلام زندہ اشتراکیت ہے!

رام دلارے ہنسا۔

جگن ناتھ نے کہا۔ سارا فتور ان آزادی پسندوں کا ہے۔ جنگ کے ختم ہونے تک یہ صبر کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ لونڈا بھی پہلے ایسے ہی خیال رکھتا تھا۔ کانگرس میں کام کرتا تھا جی۔ اب جا کر کہیں میں نے اسے آدمی بنایا ہے جی! ہرے رام ہرے رام... رام دلارے جی ذرا دیکھنا کہیں میرے ٹرنک کی زنجیر ڈھیلی تو نہیں ہو گئی۔ کم بخت یہ گاڑی بھاگم بھاگ چلی جا رہی ہے۔

انٹر کلاس کا ڈبہ نہ تھرڈ کلاس کی سی توانائی رکھتا ہے، نہ فرسٹ سیکنڈ کی سی امارت۔ اس کی شخصیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے سماج میں متوسط طبقے کی۔ یعنی غریبی اور امیری کی سب برائیاں اس میں موجود ہوتی ہیں۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کہیں سہارا نہ پا کر میں نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا اور اپنے گاؤں کی چوہدی کا انتظار کرنے لگا۔

تخیل میں وہ ہرے بھرے کھیت گھومنے لگے۔ آم کے پیڑوں کے نیچے مور ناچنے لگے۔ ہوا کی مہک ناک میں گھسی چلی آرہی تھی۔ کانوں میں کوئل اپنا سُریلا نغمہ ڈھال رہی تھی اور محبوب کے پائل کی جھنکار اور پنگھٹ پر شرمیلی نگاہوں اور بے باک قہقہوں کا ہجوم اور چوپال میں بڈھوں کی باتیں۔ سید اور پنڈت، کھتری اور کائستھ، کمین اور مزارع۔ سیدھے سادے، بے غرض نہ سہی لیکن رفاقت پسند اتنے کہ جان دینے پر تیار۔ دور سے مہرانی سرائے کا منارہ دکھائی دے گا۔ پھر گاؤں کے کھیت گھومتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سانولے سلونے بچے ہاتھوں میں غُلیل لیے ہوئے چیختے ہوئے گاڑی کے قریب آجائیں گے۔ اسے دیکھ کر مُنّو چچا ... منّو چچا .... کا شور مچائیں گے .... گاڑی پنگھٹ کے سامنے سے گزرے گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ بھی ....

چودھری ابھی آئی بھی نہ تھی کہ گاڑی دھیمی ہوتی گئی۔ پھر زور سے سیٹی بجانے لگی۔ پھر رُک رُک کر چلنے لگی۔ پھر رُک گئی۔

کیا ہوا؟

کیا ہوا؟

نیجی پور کا گاؤں آگیا؟

"نہیں تو" میں نے غصّہ سے کہا۔

سب لوگ باہر جھانک رہے تھے۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا گاڑی کے آخری ڈبّوں کی طرف جارہا تھا۔

کیا بات ہے؟ سب نے باری باری پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر کہا معلوم نہیں۔ غالبًا کوئی گائے انجن کے نیچے۔

گائے۔ ہائے ہائے! جگن ناتھ اور رام دُلارے نے اکدم کہا۔ بڑا پاپ ہوا یہ گاڑی میں چڑھنے کا یہی تو دوش ہے۔ پُرانے زمانے میں اسی لیے تو ریل گاڑی نہیں بیل گاڑی میں لوگ بیٹھتے تھے۔

پھر ایک آدمی بھاگتا ہوا گزر گیا۔

کیا بات ہے ؟ سب نے پُوچھا۔
ایک میم کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے ۔
ارے رے رے ! پور گرل ! کھدّر پوش پائپ نے کہا۔
پھر بہت سے لوگ ڈبوں سے نکل پڑے ۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔
ایک مسلمان گوالا گاڑی کے نیچے آگیا ہے ۔
اِنا للہ واِنا الیہ راجعُون ! مولوی کرم علی نے کہا۔
جی ایک بکری ۔ گوالا نہیں ۔ گائے نہیں ۔
نہیں ۔ زنانے ڈبے میں ایک بدمعاش گھس گیا اور زبردستی ۔ ....
سچ مچ ۔ ہے ہے ہے .... نہ جانے جگنا تھ کھتری کو ہنسی کس بات پر آئی تھی۔
ایک جیب کترا کود پڑا۔
بچّہ گر پڑا تھا۔ زنجیر کھینچی گئی۔
بیجی پور یہاں سے کتنی دور ہے ۔ میں نے پوچھا۔
لو اسے اپنے گاؤں دیکھنے کی پڑی ہے ۔ لالہ جگن ناتھ کھتری نے چین بر جبیں ہو کر کہا۔
دیکھ ۔ میں تجھ سے کہے دیتا ہوں ۔ میں تجھے سیدھا لکھنؤ لے جاؤں گا ۔ پہلے بزنس کا دھندا کر پھر گھر جانے دوں گا ....
اتنے میں گارڈ سامنے سے گزرا ۔ اس نے کہا ۔ آگے ریل کی پٹڑی پر سے ایک مال گاڑی اُتر گئی ۔ کسی نے شرارت کی تھی غالباً ۔ آٹھ ڈبے اُتر کر پاش پاش ہو گئے !
اِسی وقت اُلٹی ؟
نہیں ۔ کل رات کو ۔ لائن اس وقت سے ٹھیک کی جا رہی ہے ۔
کس کی شرارت ہو سکتی ہے !
آزادی پسندوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ۔ لفنگے !
سب کانگرس کا قصور ہے ۔ لالہ جگن ناتھ کھتری نے کہا۔

گارڈ نے یکایک مُڑ کر کہا۔ نہیں۔ پولیس کل رات سے تفتیش کر رہی ہے۔ چند سپاہیوں نے بیجی پور کے گاؤں والوں کو ملزم ٹھہرایا ہے۔

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

لونڈے تُو تو آزادی پسندوں کے ساتھ کام کر چکا ہے۔ مولوی کرم علی نے میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سر جُھکا لیا۔

یکایک گاڑی دھیمے دھیمے پھر چلنے لگی۔

شکستہ ڈبے لائن کے دونوں طرف نظر آئے۔ پھر اپنے گاؤں کی چوحدی، سرائے کا منارہ ایک گہرے سیاہ دھوئیں میں ملبوس تھا۔ کھیتوں میں نہ مور تھے نہ کوئل نہ بچوں کی غلیلیں .... کوئی بھی تو ہمارے استقبال کو نہ آیا۔ گاڑی آگے بڑھتی گئی۔ سارے گاؤں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چھپر جلے ہوئے تھے۔ انگنائیاں خاموش اور پنگھٹ پر کتے کھڑے تھے، اور حیرت سے اور غصّے سے مغلوب ہو کر رو رہے تھے۔

کہیں آدمی کا نشان نہ تھا۔ گھروں سے شعلے اور دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ بس۔

بیجی پور کے سٹیشن پر پولیس کا اژدہام تھا۔ وہ ہر کھڑکی کے سامنے کھڑے نظر آتے تھے اور تحکمانہ لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ "کوئی بیجی پور کا مسافر یہاں اُترے گا؟"

اور جگن ناتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کرم علی بولے۔ لڑکے تو نے آزادی پسندوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس وقت تو بھی دھر لیا جائے گا۔ تیرے گولی ماردی جائیگی۔

لعنت ہو ان فسادیوں پر! سگار سُلگنے لگا۔

ہم مسلمان اس فساد میں شامل نہیں ہیں۔ کرم علی نے ترمیم پیش کی۔

آزادی پسند غدار ہیں۔ یہ عوام کی جنگ ہے۔ ریڈیکل پائپ چہکا۔

کوئی اترنا چاہتا ہے بیجی پور کے سٹیشن پر؟ پولیس والے نے بالکل

میری کھڑکی کے قریب آکر کہا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔" کیا تم بیجی پور کے رہنے والے ہو؟"

"جی نہیں"، لالہ جگن ناتھ کھتری نے فوراً جواب دیا۔ یہ لڑکا تو رہتا ہے نا سنتری جی علی گڑھ میں رہتا ہے۔ آپ نے ہمارے کارخانے کا نام ضرور سُنا ہوگا۔ لالہ جگن ناتھ کھتری ٹرنک بنانے والے" ہئے ہئے ہئے لیجیئے یہ تازہ موسمی کھائیے۔ خاص دہلی سے منگوائی ہیں۔ واہ واہ۔ رام دُلارے جی، آپ بھی چکھیئے۔ اے ہئے کیا موسمی ہے! سنتری جی ہم تو ٹرنک بناتے ہیں۔ ہمارے ٹرنک تو فوج میں جاتے ہیں۔ ہمیں فسادیوں سے کیا مطلب!

گاڑی چل دی۔

میرے آنسو روکنے سے بھی نہ رُکے۔

اب روتے ہو۔ جگن ناتھ نے غصّے سے کہا۔ پہلے فساد شروع کرتے ہو۔ بعد میں جب سرکار بندوق چلاتی ہے تو روتے ہو۔ اگر پہلے ہی مان جاتے تو....

ایک گداگر لڑکے نے ڈبے میں داخل ہو کر گانا شروع کیا۔" ہندوستاں ہمارا سارے جہاں سے اچھا"، میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ یکایک میری نگاہیں ریلوے کے پوسٹر پر پڑیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔

ہندوستان کی سیر کیجیئے" پوری" دیکھیئے۔

ہندوستان سارے جہاں سے اچھا ہے اور ہندوستان میں پوری ہے۔

یہاں ہندوستان کا سب سے بڑا دیوتا رہتا ہے جگن ناتھ!

یکایک میرے لبوں پر تلخ مُسکراہٹ آئی۔ جیسے اس یتیم نے سب کچھ سمجھ لیا تھا۔

ہائیں۔ ابھی رو رہا تھا اب مُسکرانے بھی لگا۔ کیا بات ہے بیٹے؟ لالہ جگن ناتھ نے پُوچھا۔

"جی کوئی بات نہیں۔ لالہ جگن ناتھ جی!" میں نے مسکین بن کر کہا۔

گاڑی لکھنؤ سٹیشن کی سُرخ بتیوں تک پہنچ گئی تھی۔ لکھنؤ اُترنے والے مُسافر خوشی خوشی اسباب باندھ رہے تھے۔ اس گداگر لڑکے کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو سکتا تھا جو بار بار چیخ کر کہہ رہا تھا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ ایک پیسہ .... سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ ایک پیسہ ....!

گاڑی سے اُترے تو پھر وہی پوسٹر سامنے تھا۔ وہی جگن ناتھ جی کے مندر کی تصویر تھی۔ یہ مندر جو ہندوستان میں واقع ہے۔ یہ دیوتا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔ ٭

———— ⁂ ————
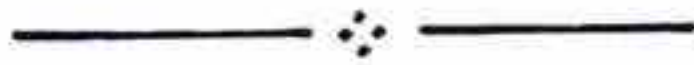
ایک گرجا، ایک خندق

اس دن میرے دوست مجھے زبردستی گھسیٹ کر راج ہوٹل لے گئے۔ راج اور برین بمبئی کے سب سے بڑے دو ہوٹل ہیں اور کیوں کہ ہوٹل نئی تہذیب کے مندر ہوتے ہیں اس لئے ہر شریف آدمی چھ بجے کے بعد یہاں نظر آتا ہے۔ یوں تو میں بھی اچھا خاصہ 'ہوٹل گرد' ہوں لیکن راج اور برین میں جانا مجھے ہمیشہ عجیب سا لگتا ہے۔ کہنے کو تو یہ بمبئی کے سب سے بڑے ہوٹل ہیں لیکن جتنی طوائفیں ان دونوں ہوٹلوں میں آپ کو نظر آتی ہیں، بمبئی کے کسی دوسرے ہوٹل میں نظر نہ آئیں گی۔ طوائفیں اور دلال ساتھ ساتھ میزوں پر بیٹھے ہوئے آپ کو ملیں گے۔ اس میز پر آپ کاؤس جی دامن گیر کا خاندان دیکھیں گے تو ان کی بغل والی میز پر آپ کو وہ پولش عورت نظر آئے گی جس کا ایک فلیٹ تو کولابا میں ہے، اور ایک جھونپڑا جوہو تٹ پر، اور جس کی فیس کولابہ میں پچاس روپے ہے تو جوہو پر سو روپیہ، اور تاج میں تین سو سے پانچ سو تک۔ ایک اور پرنس محبت جنگ شاہزادی کرّوفر کے ساتھ تشریف فرما ہیں تو ان کے ساتھ والی میز پر امرتسر والی الماس بیگم دھری ہوئی ہیں جنھوں نے لٹھے کے پھولدار پیٹی کوٹ پر ایک دودھیہ بنارسی ساڑی پہن رکھی ہے۔ ساڑی سے بلاؤز تک شریر ننگا ہے اور بغلوں کے پسینے سے خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ بلکہ شاید یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی میز پر راجے اور رانیاں اور طوائفیں اور ان کے دلال اور ویاپاری لوگ اور فلم اسٹار نظر آجاتے ہیں، مطلب ایک ہی وقت میں اتنی دکانیں نظر آجاتی ہیں کہ طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ آدمی سوچتا ہے، ہم تو مزہ لینے آئے تھے، یہاں ان کمبختوں نے بازار کھول دیا۔ ہر آدمی جھپٹا مارنے کو بیٹھا ہے۔

جو لڑکی ہے وہ رنگ اور روغن سے اتنی خوبصورت بنی بیٹھی ہے کہ اس کی اصلی خوبصورتی ختم ہوگئی ہے۔ جو آدمی ہے وہ یوں اکڑا اکڑا بیٹھا ہے جیسے ابھی لانڈری سے دھل کر آرہا ہے۔ یہاں بن سنور کے ایسے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جن سے محفل کی شان پیدا ہوتی ہے۔ یہاں غائب ہے۔ ——— ایسا نہیں ہے کہ مجھے طوائفوں سے کوئی نفرت ہے یا یہاں شریف لوگ نہیں آتے۔ لیکن صاحب! کوئی بات بھی تو ہو۔ ہر لڑکی نے وہی سُرخی لگا رکھی ہے، وہی گاجہ، وہی کاجل کی لکیر۔ سارے ہوٹل میں گھوم جائیے، آپ کو ایک بھی ایسا آدمی نہیں ملے گا جس نے دو دن سے شیو نہ بنائی ہو۔ اور عقل مند ایسے ہیں کہ برسوں سے ماتھے پر جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں اور کوئی انھیں صاف کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لکھنؤ کے بیش قیمت غرارے، پنجاب کی اسٹائلش شلواریں اور پارسنوں کی دودھیا ساڑھیاں، جو بدن پر کڈ لیدر کی طرح ایسی مڑھی ہوتی ہیں جیسے ماں کے پیٹ ہی سے ساڑھی باندھ کر آئی تھیں، لیکن بس، اس کے بعد کچھ نہیں۔ آپ کسی پر بات کیجیے (صرف ایک موضوع کو چھوڑ کر) اگر پارسن ہوگی، تو کہے گی "سو بجھے"، یوپی کی ہوگی تو بڑی شان سے "خوب!" اور پنجابن ہوگی تو مُسکرا کر کہے گی "ہلا جی!" اور اس کے بعد آپ سر پکڑ کر رو دیئے، چیخئے، چلّائیے۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے۔ آدمی اکڑے بیٹھے رہیں گے، لڑکیاں اُدھک ہنسیں گی نہیں (کہیں چہرے پر کوئی سلوٹ نہ پڑ جائے)، روئیں گی بھی نہیں، پیسٹری کو انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے ایسے پکڑیں گی جیسے پیسٹری کا ٹکڑا نہیں، کیکڑا کھا رہی ہیں۔ شیری کا گلاس اس نزاکت سے اٹھائیں گی جیسے اس کے بوجھ سے کمر دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ اور آپ ان کے پتّے سے ملئے تو دو دو من کی لاش ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس دیش کے باشندے ہیں یہ لوگ سیاست ادب اور آداب ——— سے تو خیر یہ لوگ واقف ہیں ہی لیکن الگ کسی موضوع پر بھی ——— (صرف ایک کو چھوڑ کر) ان کے ماتھے میں بجلی کی رو نہیں دوڑتی، کنکشن نہیں ہوتا۔ یہ لوگ امریکی اور انگریزی ٹائی کا فرق نہیں جانتے۔ زٹر برگ اور جٹر مبا کا بھید نہیں جانتے ایل جان سن اور سیناترا کے گانے کا فرق معلوم نہیں۔ شنغان اور جاپانی نقلی ریشم کی پہچان نہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ ریشم کا کپڑا ریشم کے کیڑے سے تیار ہوتا ہے یا گھوڑے کے مُنہ سے نکلتا ہے۔ آدمی ہیں

کہ اپنی بیوی کا نام بھی نہیں بتا سکتے، اور لڑکیاں ہیں کہ اپنے بچوں کی تعداد بتانے سے لاچار ہیں۔ ہاں برائی آپ جس کی بھی چاہیں سن لیجئے۔

"ہز میجیسٹری گھوڑی بہت اچھی ہوتی ہے" آپ نے کہا، "آج تک کوئی ریس نہیں ہاری۔"

"سو بچنے؟ ارے کیا بات کرتے ہو، یہ تو ٹرک ہے پلے ارز کو دھوکہ دینے کی، اگلی ریس میں دیکھنا۔ مجھے ٹپ ملا ہے ٹپ! (کان میں) جنگل داس بکواسا کے جوکی نے بتایا ہے، اب کے وہ ہز میجیسٹری کو کھینچ لے گا۔ سالے ریس کی اور بات ہے۔ ہم تو بمبئی میں پانچ پشت سے ریس کھیلتے آئے ہیں۔ لاکھوں روپے ہار دیئے۔ آئی نو اٹس انس اینڈ آؤٹس۔ (میں اس کے سب بھید جانتا ہوں۔) سالا سوں بات کرے چھے۔"

ریس کی بات تمام ہوگئی۔ سامنے سے ایک پنجابی پائلٹ گزرا۔ موٹی پارسن نے اسے لوبھی نظروں سے تاکتے ہوئے کہا، "فوج میں سارے کے سارے پنجابی نظر آتے ہیں، مگر ایک بات ہے، جوان اور تندرست ضرور ہوتے ہیں اور خوبصورت اور خوش پوش بھی۔"

"خوب!" لکھنؤ کے غرارے نے خوب کہا اور اس کے بعد جو چہکنا شروع کیا تو دس منٹ تک پنجابی پائلٹ کو اور اس کے پرانت کو وہ رگیدا وہ رگیدا کہ بیچارے کی پتلون بھی اتار ڈالی۔

اس کے بعد موضوع بدلنے کے لئے دوست لوگوں نے مہارانی شام بہار اور ان کی دو جوان لڑکیوں کو تاکا جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے نکل کر ہال میں داخل ہو رہی تھیں۔ خوبصورت پوشاک، خوبصورت موتیوں کے ہار، وہ تینوں فرش پر اس طرح میلتے اور رعب سے چل رہی تھیں جیسے وہ خود نہ چل رہی ہوں بلکہ کوئی بیرا ان کے قدموں کو تشتری میں رکھ کر آگے آگے لا رہا ہو۔

میرے پیچھے والے سیٹھ گھنشیام داس جوہری نے کہا، "مہارانی شام بہار کے کنٹھ میں آپ جو ہار دیکھ رہے ہیں، یہ ہماری دکان کا ہے۔ ساڑھے سات لاکھ میں خریدا ہے مہارانی نے —— بڑی اچھی ہے مہارانی۔"

"ہلاجی،" شلوار بولی، "اس کے ایڈیکانگ سے پوچھو۔ بڑھیا ہوگئی ہے پھر بھی ایسے ایسے جوان ایڈیکانگ رکھ چھوڑے ہیں۔ میرا بھائی اجیت سنگھ اس کی نوکری چھوڑ کر چلا آیا۔"

"کیوں؟"

"اس کا اس کی لڑکی کے سنگ یارانہ ہوگیا تھا — وہ جو ہے نہ چھوٹی والی، ہی ہی ہی!" وہ زور سے ہنسی۔ پھر ایک دم مون ہوگئی (زیادہ ہنسنے سے چہرے پر جھرّیاں پڑ جاتی ہیں — میکس فیکٹر۔)

"ایسی دو چار پارٹیاں دیکھ چکنے کے بعد مجھے تو راج یا برین ہوٹل میں جانے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی لیکن دوست پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ حقیقت میں ہم لوگ چار بجے سے اسکاچ وسکی کی تلاش میں تھے لیکن کمبخت کہیں سے ملتی ہی نہ تھی۔ ایک تو لڑائی کا زمانہ، دوسرے بلیک مارکیٹ تیسرے امریکی سپاہیوں کا آگمن بمبئی میں خوبصورت سے خوبصورت لڑکی مل سکتی تھی اور وہ بھی بہت سستی، لیکن اسکاچ وسکی کسی قیمت پر نہ ملتی تھی۔

"ہم راج نہیں جائیں گے، وہاں اگر کوئی ہمارا قرض خواہ مل گیا تو، اور اگر اس نے اپنی ہنڈی کا تقاضہ کر دیا تو....."

"ابے کوئی نہیں ملے گا۔"

"اور اگر وہاں ورلی والی بھونیشوری مل گئی تو؟ وہ تو ہر روز شام کو وہاں جاتی ہے؛ کبھی کسی کنور صاحب کے ساتھ، کبھی کسی امریکن کے ساتھ، کبھی کسی فلمی مصنّف کے ساتھ۔ اور اگر اس نے وہ ڈیڑھ سو روپے مانگے، جو اس کے ہماری طرف نکلتے ہیں، تو پھر؟ اور اگر اس نے راج ہی میں چپل اُتار لی تو، بڑی چھچھوری گھاٹن ہے۔"

"ابے تو چلے گا یا باتیں بنائے گا بیٹھے بیٹھے؟"

"اور پھر اسکاچ تو وہاں بھی نہیں ملے گی۔ خود راج میں رہنے والے گراہکوں کو نہیں ملتی۔ بیچارے شہزادے اور جوہری اور چاندی کے سٹّے اور نیتا جن کے حکم کا سکّہ دُنیا میں چلتا ہے — وہی آسٹریلین وسکی پیتے ہیں جس سے گھوڑے کی لید کی بو آتی

ہے، یا ساؤتھ افریقن وسکی، جیسے سونگھ کر منٹو کی کہانی "موتری" یاد آجاتی ہے۔"
اب کے انھوں نے مجھے کندھوں سے پکڑا اور اٹھا کر کار میں ڈال دیا۔
وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ نہ اسکاچ وسکی ملی۔ نہ انگلش جن نہ فرینچ شیمپین۔ ہمارے ساتھ کی بیچاری لڑکیوں کے لئے شیری تک تو ملی نہیں اور یہ بیچاری ہندوستانی پاک لڑکیاں دیسی گملٹ کیا پیتیں جس سے نشہ ہی نہیں ہوتا۔ اور جس چیز سے نشہ ہی نہ ہو اسے ہماری شریف شہر ملی لڑکیاں —— کیوں پینے لگیں؟ ایک تو پیسے خرچ کرو اور اس پر بھی نشہ نہیں —— لہذا ہر ایک نے ایک ایک گلاس ٹماٹو جوس کا پیا۔
بالکل اسی وقت اہلیہ سبحان ہماری میز کے سامنے سے گزر گئیں۔ سفید شلوار، کاسنی قمیص، کاسنی دوپٹا، کاسنی ناخن، کاسنی لپ اسٹک، ہماری طرف گھورتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے روکنا —— چاہا لیکن وہ بجلی —— کاسنی بجلی کی طرح گھوم گئی۔ اہلیہ سبحان کے بارے میں درخواست ہے کہ انھیں دیکھ کر دوست لوگوں کو چاہے عورت کا دھوکہ ہوتا ہو مجھے ہمیشہ چوہے دانی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کی جانکاری مجھے بھی نہیں۔ بس ایسا ہوتا ہے۔ (بعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے دوسرے دن میرا ذکر ان الفاظ میں کیا، "وہ کل راج میں بیٹھا شراب پی رہا تھا، ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ اور میں تو راج میں بال بنوانے گئی تھی۔")

راج سے نکل کر ہم لوگ برین میں آئے۔ یہاں دوسرے درجے کے لوگ آتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار سے اوپر اور دو لاکھ سے کم ہے۔
یہاں وہ راجے اور راج کمار نہیں آسکتے جن کی ریاست کا گھیرا تین میل سے کم ہوتا ہے اور انٹر کلاس میں سفر کرتے ہوئے بھی سوچتے ہیں کہ ریاست کا خزانہ اس کا بل کہاں سے دے گا؟ اس بھارت، سورگ پری، میں ابھی تک سینکڑوں ایسے راجے اور رانیاں ہیں جن کے لئے بمبئی میں کاسموپالیٹن ہوٹل ہی 'سوائے' اور 'کلیرج' سے بڑھ کر ہیں۔
برین میں رم مل سکتی تھی اور سوسن اور کاٹ ۹۶۵، اور یہاں گوانی آرکیسٹرا ساری

انگلش فلموں کی دھنیں بجایا کرتا تھا اور ہندوستانی لڑکیاں، غرارے، شلواریں اور ساڑے پہنے
ناچ رہی تھیں اور امریکی اور ٹامی اور یہاں کے کپتان اپنی محبوباؤں کے ساتھ اس طرح چپکے ہوئے
تھے جیسے انھیں گھول کر پی جائیں گے۔ خدا جانے انسان اتنا پیاسا کیوں ہے؟ دن رات تو
لڑکی، لڑکے کا ساتھ رہتا ہے، اس کے بعد بھی اتنا پیاسا ہے، اتنا تھوڑا دل ہے۔ یہ ایسا
بدتمیز کیوں ہے؟ اور دس میل دور سے کوئی لڑکی نظر آجائے، وہ وہیں کھڑا ہو کر کتے کی طرح
ہانپنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا شاید یہ بیچارہ ہندوستانی ہی اس روگ میں مبتلا
ہے، اب زیادہ تر ٹامیوں اور امریکنوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ لعنت ساری دنیا میں ہے
لہذا لڑکی کو دیکھتے ہی ایک ایسی ننگی بھوک سی چہرے پر نظر آنے لگتی ہے کہ آدمی کا جی چاہتا ہے
کہ یا تو فوراً پاگل خانے میں چلا جائے یا ان سب کو پاگل خانے میں بھیج دے۔ جہاں انھیں
برومائڈ کھلا کھلا کر ان کا دماغی توازن —— ٹھیک کیا جائے۔ لیکن کچھ ہوگا نہیں، یہ سب سوچنا
بے کار ہے۔ انسان ابھی تک سو فیصدی جنگلی، وحشی اور بھوکا —— ہے وہ ابھی تک
دو طرح کی بھوک بڑی بے چینی سے محسوس کرتا ہے ایک تو پیٹ کی بھوک اور دوسری کام کے متعلق
بھوک۔ آپ اس کی یہ دونوں بھوکیں ختم کر دیجیے اور پھر چاہے اسے گولی مار دیجئے۔ جنگ کے
ماہر اسی لئے تو بھرتی کرتے ہوئے ان دونوں باتوں کو دھیان میں رکھتے ہیں اور اس کے بعد
انھیں گولی مار دیتے ہیں۔ یہ اونچے اور گگن چمپی جیون —— کی چیخ پکار سب بکواس ہے!

برین ہوٹل کے ناچ گھر میں سب لوگ یا تو شراب پی رہے تھے، یا یورینل میں پیشاب کر رہے
تھے، اور ہر ایک کے ماتھے پر ایک آرام گاہ کا نشان لگا تھا۔ کم از کم میری نظروں میں سیکڑوں
کمرے کھل رہے تھے۔ تنگ کمرے، کھلے کمرے، ٹیڑھے کمرے، بدبودار کمرے، فلیٹوں کے کمرے،
بنگلوں کے کمرے، جھونپڑوں کے دروازے یا ٹاٹ کی ریت۔ ایک آدمی، ایک لڑکی، ایک بوتل،
ایک پلنگ۔ کتنی گھٹیا ہے انسانیت —— ابھی! چھ ہزار سال کی انسانیت کی بلندی ابھی پلنگ کی اونچائی
سے اونچی نہیں ہوئی، چھ ہزار سال میں انسانیت تین فٹ سے اوپر نہیں اٹھی اور ابھی اسے چاند تک پہنچنا
ہے، تاروں کو چھونا ہے۔ یہ شاعر بھی کیا بیکار کی سوچتے ہیں، چاند اور تاروں تک جا پہنچتے ہیں، اور
حقیقتاً یہ ہے کہ جہاں تک سیکس Sex کا تعلق ہے، ایک کتے، ایک کوکروچ اور ایک

انسان میں کوئی فرق نہیں۔

برین سے مایوس ہوکر لوٹے تو ارادہ کیا کہ جُوہو چلا جائے۔ وہاں ایک فرانسیسی عورت نے ہوٹل کھولا تھا۔ وہ پہلے کولابہ میں اپنا دھندا کرتی تھی اور جنگ کا زمانہ تو آپ سمجھئے 'بوم پیریڈ' ہوتا ہے۔ دو سالوں ہی میں اس نے اتنا کام لیا کہ اسے جُوہو پر ایک اپنا ہوٹل کھولنا پڑا۔

"وہاں اسکاچ ضرور مل جائے گی۔"

میں نے کہا، "اب مجھے تو چھٹی دو، اب میں جُوہو نہیں جاؤں گا اور نہ اسکاچ پیونگا اور اس فرانسیسی چڑیل کی صورت دیکھ کر تو مجھے آگ لگ جائے گی۔ کمبخت ایسی ماہر نظروں سے دیکھتی ہے، معلوم ہوتا ہے آپ کی جیب کے سارے نوٹ گن رہی ہے۔ میں نہیں جاؤں گا اب کہیں، تم مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

"اکیلے کیا کرو گے تُم؟"

"کیا کسی سے ملاقات کا وقت آگیا ہے؟"

"ہمارے ساتھ جو یہ لونڈیا ہے کیا تمھیں پسند نہیں؟"

میں ہاتھ جوڑ، پاؤں پڑا، اگلے اتوار کا وعدہ کر کے ان سے رخصت لی۔ سر میں سخت درد ہو رہا تھا، اس لئے سمندر کے کنارے ہولیا، اور دور تک ٹہلتا چلا گیا۔ ٹہلتا ٹہلتا 'گیٹوے آف انڈیا' پہنچ گیا۔

یہاں ایک لڑکی جیسی عورت کا سا لباس پہنے گیٹوے آف انڈیا کی اُونچی چھت کے نیچے کھڑی گا رہی تھی اور ناچ رہی تھی، اور اس کے گرد پارسیوں، ٹامیوں، امریکنوں اور درمیانہ درجے کے ہندوستانی طالبعلموں کا ہجوم تھا۔ لڑکی تیلی چھریری، خوبصورت چہرہ اور سفید رنگ کی تھی۔ چمکتے ہوئے دانت، اوپر سیاہ آنکھیں، بالکل سیاہ، اور بیحد چنچل شرارت سے بھری ہوئی۔ اور اوپر کالے گھنگھرالے کیس، ہر زلف ایک ناگن سی لہراتی ہوئی، اور ناچتے ناچتے مُسکراتے ہوئے ہونٹوں میں کوندھ کی سی لپک اور یکایک ان زلفوں کا جھٹک جانا، جیسے دنیا پر کالی گھٹائیں چھا گئی ہوں! اور اسپینی گیت میں موری سنگیت کا وحشی لہراو! اس سنگیت کے ترنم پر اور اس کامنی کے شریر میں پورب اور پچھم دونوں مل گئے تھے، اور جب بھی کوئی دو اجنبی چیزیں ملتی ہیں، ایک نئی چیز

بن جاتی ہے۔ اس وجہ سے ـــــ بالکل نئی تھی، نئی اچھوتی، ایک عجوبہ!

گیت ختم ہوگیا۔ سنگیت جم کر کامنی بن گیا۔ ناچ جوانی بیں بدل گیا۔ کارمن نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور تتلاتے ہوئے کہا:

"ایک پیشہ سینور!" (لہٰذا اک پیسہ، جناب!)

"سینور اک پیشہ!"

اور چاروں طرف سے سکّوں کی بارش ہونے لگی۔ ایک سکّہ میں نے بھی دیا۔ اس کی پتلی پتلی گرم اُنگلیاں میری اُنگلیوں سے ٹکرا کر سکّہ لے گئیں ـــ کہیں دور ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ کہیں سے اس کا جواب نہ آیا، سکّہ چلا گیا، لیکن جواب نہ آیا کچھ عجیب سی مایوسی تھی جیسے توازن بگڑ گیا ہو ایک سکّہ میں نے دیا، ایک سکّہ اس نے لیا، بات ختم ہوگئی۔ ہو جانی چاہیے تھی، لیکن مجھے تجربہ ہوا جیسے بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ انگلیاں بہت کچھ کہہ سکتی تھیں، لیکن انگلیوں میں اور نظروں میں یگانگیت نہیں تھی اور جب تک میل ملاپ نہ ہو ـــــ بجلی کی لہر پیدا نہیں ہوتی، بیچ ہی میں شارٹ سرکٹ ہو جاتا ہے۔

میں ٹہلتے ٹہلتے آگے بڑھ گیا۔ گیٹوے آف انڈیا سے بہت دور آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور میں نے گیٹوے آف انڈیا اور اس ہجوم ـــــ کو اپنے ساتھ ساتھ چلایا، تٹ کی ریت پر، پھر گیٹوے آف انڈیا اور وہ ہجوم ـــ غائب ہوگیا۔ پھر دور تک کارمن میرے ساتھ ساتھ تٹ کی لہروں پر چلتی رہی۔ پھر وہ اُوپر اُٹھ کر بادلوں میں اڑنے لگی، پھر تاروں میں جا کر غائب ہوگئی۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا اور لہریں عجیب سا راگ گانے لگیں، اور تارے پلکیں جھپک جھپک کر مجھے تعجب سے دیکھنے لگے، اور سانس اپنی ٹھنڈی میرے نتھنوں تک لائی اور میری گردن کے گرد گھومنے لگی، اور میں نے کوٹ کے کالر اُوپر کر لئے، اور مڑ کر گھر کی طرف ہو لیا۔

ایک پیشہ سینور!

سینور اک پیشہ!!

ایک پیشہ سینور !!!

اس نے مُسکرا کر آج بھی ایک سکہ میری کانپتی ہوئی انگلیوں سے لے لیا ۔ آج گیٹوے آف انڈیا آتے ہوئے اور کارمن کا ناچ دیکھتے ہوئے مجھے دسواں دن تھا ۔ یہی کارمن ، یہی اسپینی سنگیت یہی گیٹوے آف انڈیا کی اُونچی چھت ، یہی ہجوم ـــــ اس ہجوم میں کچھ چہرے ایسے بھی تھے جو میری طرح ہر روز آتے تھے ۔ اس ہجوم سے پرے پتھر کی دیوار تھی اور اس سے پرے سمندر اور سمندر میں بھاپ سے چلنے والے جہاز بھی تھے ، اور چھوٹے اگن بوٹ اور بڑے ٹولیسٹرائر اور شہریوں کی سیر کے لئے ڈیزل آئل سے چلنے والی موٹر کشتیاں جن کے انجنوں کا دھیمہ دھیمہ شور یہاں تک پہنچ رہا تھا ۔ ناریل بیچنے والا سر پر ٹوکری اُٹھائے ، ناریل لادے اُدھر سے گزرا اور ٹھٹھک کر رہ گیا ۔ وہ ہر روز اسی طرح ٹھٹھک کر رک جاتا ، جیسے ہر روز اسے ایک نیا تجربہ ہوتا تھا ۔ کچھ لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں کی پتلیاں تعجب سے پھیل جاتیں ۔ ایک سفید رنگ کی میم گیٹوے آف انڈیا کی چھت کے نیچے ناچ رہی تھی اور اس طرح سڑک پر کھلے عام ۔ وہ پہلی بار ایک سفید رنگ کی میم کو اس طرح راس دھاریوں کی طرح بھیک مانگتے ہوئے دیکھ رہا تھا ۔ کچھ لمحوں کے لئے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ تعجب سے تکتا ، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ۔

'کھوپرے کا پانی ٹھنڈا ، میٹھا ، مزے دار ، لیمن جوس سے زیادہ مزے دار کھوپرے کا گودا ، نرم ، ملائم ، ملائی کی طرح ، ریشمی اور ٹھنڈا !

ریشمی اور ٹھنڈا جیسے کارمن کا شریر !

اِک پیشہ سینور !

کارمن میرے سامنے کھڑی تھی ۔ اس کے چیلنج کرتے ہوئے ہونٹ بالکل میرے ہونٹوں کے سامنے تھے ۔ میں نے ایک سکہ اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں میں اٹکا لیا ۔ کارمن نے اپنے ہونٹ ایک جھٹکے سے ہٹا لئے ۔ ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ سکّہ اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں چلا گیا ۔ گیت ختم ہو گیا ۔ زمین آسمان کا چکّر رُک گیا ، تٹ گھومتا گھومتا تھم گیا ، لہریں کانا پھوسی کرتے کرتے چُپ ہو گئیں اور وہ امریکی فوجی کے ساتھ چلی گئی ۔

وہ ہر شام کو کسی نہ کسی کے ساتھ سیر کرنے جاتی تھی ۔ کوئی مُڑی ہوئی ناک والا گنجا پارسی

کوئی گندے دانتوں والا ٹامی، کوئی چقندر کی طرح سُرخ امریکی اسے اپنی گاڑی میں سوار کرا کے لے جاتا۔ اس کی مُسکراہٹ کہتی، کارمن تیرے ساتھ بھی جا سکتی ہے۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ میرے ہونٹوں کے سامنے آکر ہجوم میں سب کے سامنے اتنا قریب ہو کر مجھے چیلنج کرتے اور اس کے سانس کی لَو ایک شعلے کی لپک کی طرح میرے گالوں سے چھو جاتی۔ لیکن میرے دل میں ایک انجان سی جھجک تھی، ایک نہایت شرمیلی، نئی —— کلی کی طرح نازک اور آسان سی جھجک جو اس سے پہلے کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ ایک ایسی بے نام سی جھجک جو جھجک کم تھی اور چُبھن زیادہ تھی۔ جیسے میں نے اس سے پہلے بھی کارمن کو کہیں دیکھا ہے، سُنا ہے، پہچانا ہے، لیکن معلوم نہیں، کہاں؟ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ تاج ہوٹل کے پیچھے دور تک وہ علاقہ تھا جہاں فلیٹوں میں انجانے دیش کی انجانی عورتیں رہتی تھیں۔ وہیں ایک فلیٹ میں کارمن بھی رہتی تھی۔ کئی بار میں اس کے فلیٹ تک گیا اور پھر دروازہ کھٹکھٹائے بنا لوٹ آیا۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ جھجک کیوں ہے، یہ چبھن کس لئے ہے؟

اور پھر آج بہت دنوں کے بعد میں نے ہمت کر کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کارمن نے دروازہ کھولا۔ وہ سونے کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک اٹھی۔ اس کی نظریں جیسے اس کی نظریں مایوس سی ہو گئی ہوں۔ میں نے ان میں درد کی ایک تڑپتی ہوئی زنجیر دیکھی جو دوسرے لمحہ میں غائب ہو گئی تھی۔

دوسرے لمحہ میں اس نے کہا، "اندر آجاؤ" اور وہ یہ کہہ کر فوراً اندر چلی گئی، "دوسرے کمرے میں کپڑے بدل آؤں۔"

جب وہ کپڑے بدل کر آئی تو بالکل مختلف تھی۔ گاؤن ٹخنوں سے بھی نیچا تھا جس سے اس کی خوبصورت ٹانگیں چھپ گئی تھیں۔ اس نے بال اچھی شریف —— عورتوں کی طرح سنوارے تھے اور ان میں چاند کا میٹلہ لگایا تھا اور اس پر مہین ساڈ پٹہ ٹانکا تھا جو چاندی کے لہریئے سے جھلملا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک غائب تھی اور آنکھیں گہری سیاہ اور سوئی سوئی سی، اور خوفناک سی جیسے کسی طوفان کو اپنی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے ہو۔

"آخر تم بھی آ گئے؟"

میں نے کہا، "میں صرف گانا سُننے کے لیئے آیا ہوں۔"

"ایک پیشہ سینور" وہ ہنسی۔

میں نے کہا، "تم ایک پیشہ کیوں کہتی ہو، روپیہ کہو۔"

"ایک لُوپیہ سینور،" ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی، "ایک لوپیہ سینور۔"

"لوپیہ نہیں روپیہ۔"

"نہیں، میں تو لوپیہ کہوں گی، یا وہی پیشہ کہوں گی۔ بولو، کیا کہوں؟" اس نے مجھے ڈپٹ کر کہا۔

میں نے کہا، "اچھا، تو لوپیہ کہو۔ مگر پیشہ مت کہو۔"

اس نے میری ٹھوڑی چھوکر کہا، "تم بڑے اچھے لگتے ہو، بالکل اس گدھے کے بچّوں کی طرح جس پر میں ایلی کانتے میں سواری کیا کرتی تھی۔"

"تم ایلی کا۔نتے کی رہنے والی ہو؟"

"ہاں، ایلی کانتے میں میرے باپ کی بیکری تھی۔ اتنی اچھی ڈبل روٹی بناتا تھا وہ، اور میری ماں کے ہاتھ کے کرسمس کے کیک بارسلونا تک جاتے تھے اور ایلی کانتے کے بازار کا فرش پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے کھُردرے پتھر، نیلے پتھر، جن پر ہمیشہ قدموں سے چپ چپ کی آواز پیدا ہوتی تھی، اور جو بارش میں جیٹ کے ٹکڑوں کی طرح چمکتے تھے، ہائے ایلی کانتے! ہماری دکان اسی بازار میں تھی اور اس دکان کے اُوپر ہمارا گھر تھا، جہاں میں اور میرا پتا اور میری ماں اور میرے دونوں بھائی کوسترے اور گارمو رہتے تھے۔ اتوار کو ہم لوگ گرجا سے فارغ ہوکر گرونوکیپا، میں جاتے۔"

"گرونوکیلپا؟"

"ہاں،"

اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا اور کھُلی کھڑکی میں سے سمندر کا تٹ، بیرے اگن بوٹ اور جہازوں اور ڈیسٹرایروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، "گرونوکیپا، ایلی، کانتے سے آٹھ میل دور ہے۔ ہم گدھے کے بچّوں پر سوار ہو کر جاتے تھے اور ہمارے ماں باپ گدھوں کی سواری کرتے

اور ساتھ میں ڈبل روٹیاں اور مکھن اور کیک اور سینڈ وچ ہوتے، اور وہ اسپینی شراب، جو صرف اسپینی انجیروں سے بنائی جاتی ہے۔" کارمن نے اپنے ہونٹوں سے سیٹی بجائی، "ہم لوگ دن بھر گرونوکیسپا میں رہتے۔ وہاں کے گرم چشموں میں نہاتے اور تٹ کے کنارے کنارے رنگین چھاتوں کے سنسار میں سو جاتے... میری ماں بہت اچھا تیر سکتی تھی۔ وہ گوشت کے تکے اور مولی کباب زیتون کے تیل میں تل کر بناتیں۔ ہائے! وہ خوشبو ابھی تک میرے نتھنوں میں موجود ہے... تمھارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام کیا ہوگا،" میں نے مسکرا کر کہا، "میں تو ایک چھوٹا سا گدھے کا بچہ ہوں۔"

اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، "میرے گدھے کا نام ٹونو تھا۔ میں تمھیں بھی ٹونو کہوں گی، کیوں ٹونو؟"

میں گدھے کی طرح چلانے لگا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر ایک دم چپ ہوگئی۔ بولی، "میں کتنی کم ظرف ہوں۔ تم سے بالکل ایک دوست کا سا، ایک گراہک کا سا برتاؤ نہیں کر رہی۔ اچھا، میرے اچھے ٹونو، بتاؤ کیا پیو گے، شراب یا ٹوماٹو جوس؟"

"شراب!"

"کون سی؟"

"تمھارے پاس کون سی ہے؟"

"میرے پاس خالص اسپینی شراب ہے، جو میرے ہونٹوں سے تیار ہوتی ہے۔"

"کوئی دوسرا برانڈ بتاؤ۔"

"کیوں؟"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے، میں صرف گیت سننے آیا ہوں!"

"کیا میں خوبصورت نہیں ہوں، کیا جوان نہیں ہوں میں؟" وہ اپنا گاؤن ٹخنوں کے اوپر لے جانے لگی۔

"رہنے دو،" میں نے اسے کہا، "میں تمھاری خوبصورتی کی فہرست نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم سے گراہکوں کا نہیں، ایک دوست کا سلوک مانگتا ہوں کچھ گھنٹوں کے لیے ہی سہی۔"

"اچھا، تو میں تمھیں صرف ٹوماٹو جوس پلاؤں گی آج۔"

میں نے بھی پیا، اس نے بھی۔ پھر وہ مجھ سے ذرا الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی "ٹونو!"

"ہاں"

"میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔ تمھاری آواز سُنی ہے، تمھیں پہچان رہی ہوں۔"

"ادھر بھی یہی حالت ہے۔"

"لیکن یاد نہیں آتا ٹونو!"

"نہیں آتا کارمن! یہ چھوٹی سی دُنیا بہت بڑی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہوئے بھی پہچان لیتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے تم میرے بچپن کے گدھے کے بچے ہو۔"

"تمھارا خیال ٹھیک ہوگا کارمن۔ اس وقت کوئی اچھا سا اسپین گیت سنادو اور ساتھ اس کا مطلب بھی بتا دو۔"

اس کی آنکھوں میں پھر وہی ویدنا کی لہر پیدا ہوئی اور مر گئی۔ پھر ہنس کر بولی، "میں تو ہمیشہ گندے گیت گاتی ہوں، تم اس کا مطلب سمجھ کر شرما تو نہیں جاؤ گے؟"

میں چپ ہی رہا۔

وہ اٹھ کر سامنے میز تک گئی اور وہاں سے گٹار اٹھا لائی اور سامنے کرسی پر بیٹھ کر اسے بجانے لگی۔ بجاتے بجاتے بولی، "اچھا تو سنو، تمھارے لئے ایک پرانا گیت گاتی ہوں، صرف تمھارے لئے۔ ایک صاف ستھرا گیت۔ ایک معصوم بچے کی طرح بھولا بھالا گیت گاتی ہوں:

میرے چھوٹے سے سگریٹ کیس

آج تم بالکل خالی ہو

کل اتوار ہے، لیکن

کل تمھیں بھر دوں گی (سگریٹوں سے)

آج میرے پاس صرف دو سگریٹ ہیں

جنھیں تین چاہنے والے مانگتے ہیں

دو اور تین پانچ ہوتے ہیں

اور پانچ سے دس ہوتے ہیں
اور دس سے بیس ہوتے ہیں
بیس میں سے پانچ کم کرو تو پندرہ
پندرہ میں سے پانچ کم کرو تو دس
دس میں سے پانچ کم کرو تو پانچ
اور پانچ سے دس ہوتے ہیں
اور دس سے بیس ہوتے ہیں

"ہا ہا ہا!" گیت ختم ہوتے ہی وہ زور زور سے ہنسنے لگی، "دیکھا کتنا اچھا گیت تھا ٹونو، ایک لو پیہ نکال۔"

کچھ عجیب سا گیت تھا۔ بالکل معمولی الفاظوں کی تکرار تھا اور حرفوں کی گنتی۔ لیکن سگریٹوں کی کسیلی سی بو اور ان کا تیز سا ذائقہ اس میں بھرا ہوا تھا۔ اس گیت میں عجیب قسم کا دھنواں سا یا جو اندر جا کر چبھتا تھا اور کچھ ایسی لہریں چھوڑتا تھا جو دل کے تٹ سے چھو کر بہتی تھیں ــــ تم ہمیں جانتے ہو، تم ہمیں جانتے ہو، یہ دھن، یہ گیت، یہ تکرار تمھاری ہے!

میں نے اسے دس روپے کا نوٹ دیا، "کارمن، عجیب سی دُھن ہے، جانی اور انجانی بھی۔ پورا سنگیت ہے۔ ایشیائی، افریقی اور یوروپین سنگیت کا انوکھا سنگم ہے۔ جو ایک ہی وقت میں کئی لہریں پیدا کرتا ہے ــــ تمھاری خوبصورتی کی طرح جو ایشیائی ہے، جو یوروپین ہے، جو افریقی ہے ــــ

تین برّاعظموں نے مل کر اس کا خمیر اٹھایا ہے۔ تو میرے تو میرے لئے اجنبی بھی ہے اور نااجنبی بھی۔ میں تجھے جانتا ہوں اور نہیں بھی جانتا۔"

"پوری طرح سے جان لو۔" اس نے ہنس کر کہا، "سو روپے کا ہرا نوٹ چاہئے سینور!"
میں نے اُٹھ کر کہا، "تو میں جانتا ہوں، تم سمجھتی ہو، میں تمھیں سو کا نوٹ نہیں دے سکتا؟"
وہ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اور غمگین سی ہو کر بولی، "محبت کا کھیل مجھ سے نہ کھیلو۔ میں خاوند والی عورت ہوں، پھر بھی عورت ہوں۔ اس کھیل میں ہمیشہ عورت کی ہار ہوتی ہے۔ میں

کل سے تمھیں فلیٹ میں نہ گھسنے دوں گی۔"

"اپنے عاشق کو نہ گھسنے دینا، ٹونو تو آسکے گا۔"

"تم میری عقل سے دور کی چیز ہو۔ اچھا تو چلو کوئی پکچر ہی دیکھیں۔"

ٹونو اور کارمن بہت اچھے دوست بن گئے۔ ٹونو کوئی مصلح نہ تھا کہ دلت لونڈیوں کی زندگی سدھارتا۔ وہ کارمن میں دلچسپی لے رہا تھا، اپنی کسی تسلی کے لئے۔ لیکن یہ محبت کا نہ تھا، اتنا اسے معلوم تھا۔ یہ زندگی کی پکار بھی نہ تھی، یہ بھی وہ جانتا تھا۔ کارمن نہایت خوبصورت تھی ــــ جوالا مکھی لاوے کی طرح خوبصورت۔ وہ اس کے ہونٹوں کی زبان پڑھ سکتا تھا۔ اس کی کالی آنکھوں کی گہرائیاں ناپ سکتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک عجیب سی جھجک اس کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ جب تک اس جھجک کو پڑھ نہ لے، اس کا اندازہ نہ کرلے، اسے سمجھ نہ لے، وہ کیسے آگے بڑھ سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بڑے اچھے دوست بن گئے۔ وہ بڑا عقل مند آدمی تھا۔ اس کی عقل اسٹاک ایکسچینج پر آزمائی جاتی اور ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے۔ اس کی عقل ایک تیز چھری کی طرح تھی، بڑے بڑے بروکر اس سے ڈرتے تھے۔ اسٹاک ایکسچینج پر اس کے کھیل لوگوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ لوگ ہارتے اور جیتتے لیکن وہ ہمیشہ جیتتا۔ وہ اسٹاک ایکسچینج کی ہر گتھی سلجھا سکتا تھا، صرف اس سے کارمن کے نشے کی گونج کا تجزیہ نہ کر سکتا تھا۔

وہ دونوں بڑے اچھے دوست بن گئے۔ ٹونو نے کارمن کو سدھارنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ کارمن گیٹ وے آف انڈیا میں ناچتی تھی، گاتی تھی روپیہ پانی کی طرح برستا تھا، شام کو کسی کے ساتھ سیر کے لئے چلی جاتی، پھر رات باہر رہتی یا فلیٹ میں شراب پی کر سو رہتی۔ ٹونو اسے تیسرے پہر کے قریب سوتے سے جگاتا۔

"اٹھو، اٹھو!"

"سونے دو مجھے۔"

"اٹھو، اٹھو، تمھاری دکان کے کھلنے کا وقت آگیا۔

"ٹونو، چائے بناؤ میرے لئے۔

"ٹونو، میں آج ہرا گاؤن پہنوں گی۔

"ٹونو، میں آج ساڑی کیوں نہ پہنوں؟"

لیکن مُنھ ہاتھ دھو کر وہ ہمیشہ زیڈ کے رنگ کا گاؤن پہنتی جو اس نے ٹونو سے پہلی ملاقات کے دن پہنا تھا۔ وہی گاؤن، وہی مٹیلا، وہی دُپٹہ! پھر وہ دونوں چائے پیتے، پھر وہ اسے اپنا ایلبم دکھاتی —— "اپنی ماں کا فوٹو، اپنے باپ کا فوٹو۔ یہ میرا بڑا بھائی ہے، یہ مجھ سے چھوٹا بھائی ہے۔ یہ میری پھوپی ہے۔ یہ میرا منگیتر تھا —— بیلوں سے لڑنے والا —— خونی بیلوں سے لڑنے والا —— ڈان گریزیانو۔"

گریزیانو تنگ پتلون اور پٹکا باندھے کھڑا تھا، اس کی چھاتی چوڑی تھی، ہونٹ پتلے، آنکھیں گہری اور رعب دار اور وہ پوری بانہوں والی قمیص پہنے ایک عجیب شان سے کھڑا تھا۔ دائیں طرف فوٹو گرافر نے زیتون کی ایک ٹہنی سے توازن قائم کیا ہوا تھا۔

پہلی بار جب میں نے یہ فوٹو دیکھا تو پوچھا، "کارمن! پھر کیا ہوا؟"

اس نے زور سے ایل بم بند کر دیا اور میری طرف دیکھ کر بولی، "تمھیں پوچھنے کا کوئی حق نہیں، گیٹ آؤٹ!"

میری حیرت بڑھ گئی۔ لیکن اس نے مجھے کمرے سے باہر نکال کر ہی دم لیا۔ اس دن کے بعد میں نے کبھی اس سے کچھ نہیں کہا، لیکن ہم دونوں ہر روز یہ ایل بم دیکھتے، خوشی خوشی چائے پیتے، اس کے بعد وہ گیٹ وے آف انڈیا چلی جاتی، میں اپنے دوستوں میں آجاتا۔ ہفتے میں دو دن میں اور کارمن باہر جاتے۔ یہ دو دن اس کے ٹونو کے ہوتے تھے۔ اس دن اس کی دکان بند رہتی تھی۔ اس کے گالوں پہ غازہ نہ ہوتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سُرخی نہ ہوتی تھی، اس کی آنکھوں میں میکرا نہ پڑتا تھا۔ اس دن ایک اسپینی گاؤں کی لڑکی کی طرح وہ میرے ساتھ چلتی۔ ہنستی، کھیلتی، ناچتی، گاتی، ننگے پاؤں دوڑتی، جھاڑیوں سے تتلیاں پکڑتی، راستہ چلتے ہوئے بچّوں سے پیار کرتی۔ ہم لوگ شہر سے بہت دور نکل جاتے، کبھی کلیان کے پاس، کبھی گھوڑ بندر سے آگے۔ میرے پاس اسپینی گیتوں کا مجموعہ ہو گیا تھا۔ میں اپنے دوستوں میں بہت بدنام ہو گیا تھا۔ لیکن جھجک ابھی تک قائم تھی۔

ایک اتوار کو میں نے اس سے کہا، "کارمن، میں اگلے بدھ کو نہ آسکوں گا۔"

"کیوں؟"

"اس دن میری بہن کی شادی ہے۔"

"تمھاری بہن کی شادی ہے اور تم مجھے نہیں لے چلو گے؟"

میں سٹپٹا گیا، کچھ نہ کہہ سکا۔

اس نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سختی سے کہنے لگی، "ٹونو، میں ضرور چلوں گی۔ کارمن تمھاری بہن کی شادی میں ضرور چلے گی۔ تم مجھے لے جاؤ نہ لے جاؤ، میں فوراً وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"اچھا، تو میں تمھیں فوراً آ کر لے جاؤں گا۔"

"اور تمھیں، ابھی اسی وقت، میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"بازار میں، مجھے کچھ خریدنا ہے۔"

وہ سب کچھ اٹھا لائی۔ جتنے روپے تھے اس کے پاس۔ اس کے پاس بہت روپیہ تھا۔ اس نے بہت کچھ خریدا، زیور، کپڑے، برتن۔ جہاں میں نے کچھ کہا اور اس نے ڈانٹ پلائی، "تمھیں اس سے کیا، یہ میرے روپے ہیں۔ میں چاہے انھیں پھونک دوں چاہے جلا دوں۔"

میں نے کہا، "سمجھ سے کام لو، پاگل نہ بنو تم ہی نے تو کہا تھا، عورت عشق کے معاملے میں ہمیشہ ہار جاتی ہے۔"

"کون سُور تم سے عشق کرتا ہے؟"

شادی کی رات وہ سہیلیوں میں ایسے گھُل مل گئی کہ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ وہ اجنبی لڑکی، وہ بازار کی طوائف شرافت کا جھوٹا لباس پہنے شادی کی رسموں میں شامل ہو رہی تھی۔ اور ڈھولک بجانا سیکھ رہی تھی۔ عجیب عجیب سے سوانگ بھر کر مہمان عورتوں کا جی بہلا رہی تھی، ناچ رہی تھی، گا رہی تھی، دُلہن کے مہندی رچا رہی تھی۔

پھر بارات آ گئی، دولہا کو اندر لایا گیا، سہیلیوں نے گیت گائے۔ دولہا کے سر پر سے

روپے اتارے گئے۔ کارمن نے کانپتے ہاتھوں سے روپے گھما کر پھینکے اور پھر دولہا کو ہاتھ سے پکڑ کر ڈیوڑھی کے بھیتر لائی۔

پھر وہ بھاگی بھاگی دلہن کے پاس پہنچی اور دیر تک گھونگھٹ اٹھائے اس کی صورت دیکھتی رہی۔
پھر اس کا چہرہ پیلا ہوگیا اور وہ کانپنے لگی اور کانپتے کانپتے گر پڑی۔ دیر تک بیہوش پڑی رہی۔ جب ہوش میں آئی تو مجھ سے کہنے لگی، "ٹونو، مجھے گاڑی منگوا دو، میں جاؤں گی۔"

میں نے کچھ نہیں کہا، میرا دل اس کے بہت قریب آگیا تھا۔ وہ چلی گئی۔

ایک بجے کے قریب شادی کی رسم پوری ہوگئی اور مبارکباد کے ترانے نے، عورتوں کے گیتوں نے اور بینڈ کے نغموں نے اور بچوں کے شور غل نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور ان ساری آوازوں، شکلوں کے اوپر کارمن کا چہرہ گھومنے لگا۔ مون چہرہ، ہنستا ہوا چہرہ چپ چاپ میری طرف تاکتا گیا۔ دیر تک فضا میں تیرتا رہا یہاں تک کہ میں نے بھی گاڑی لی اور اس میں بیٹھ کر اس کے یہاں جا پہنچا۔

وہ شراب پی رہی تھی۔

اس نے مجھے بوتل دکھا کر کہا، "اصلی بوکھے ہے۔ پیوگے؟" میں نے اس سے گلاس چھینتے ہوئے کہا، "سو جاؤ۔"

وہ چیخ کر بولی، "میرا گلاس واپس کردو۔ تم نے میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا۔ اب میرا گلاس بھی مجھ سے چھینتے ہو کمینے!"

میں نے کہا، "میں نے چھینا ہے تم سے؟ تم ان کپڑوں اور زیوروں کا تو ذکر نہیں کر رہی ہو؟"

"نہیں، میں تمہارا ذکر کر رہی ہوں، تم جنرل فرانکو ہو۔"

"کیا بک رہی ہو؟"

"میں بک رہی ہوں؟ سُنو! میں بک رہی ہوں! واہ رے میرے جنرل فرانکو!"

"میں ٹونو ہوں کارمن! لو اب سو جاؤ۔"

"نہیں، تم مجھے وہاں شادی پر کیوں لے گئے؟ میں نے کہا تھا، پھر تم بھی مجھے وہاں کیوں لے گئے؟ کرائسٹ! اچھا ہوتا اگر میں مر جاتی!"

" کارمن ! کارمن !!

" کارمن کو کون بُلا رہا ہے ؟ وہ کارمن جو اپنے ماں باپ کی بیٹی تھی - اپنے بھائیوں کی بہن تھی، اپنے منگیتر کی ہونے والی بیوی تھی ، اسے جنرل فرانکوں نے پھانسی پر چڑھادیا۔ زندہ باد فرانکو ؟"

کارمن کی سیاہ پتلیوں میں شعلے ناچ رہے تھے - اس نے اپنی انگلیوں میں میرے ہاتھ کی انگلیاں لے لیں۔ شکنجے کی طرح کس لیں، بولی، " میں تم سے پوچھتی ہوں، تم اس طرح سے ہمیں کیوں مارتے ہو؟ پہلے تم نے میرے ماں باپ کو مارا ، کیوں کہ وہ کمیونسٹ تھے - پھر میرے دونوں بھائی جنگ ــــ میں مارے گئے - ایک میڈرڈ میں ، ایک بارسلونا میں - میں اور میرا منگیتر ایلی کانتے سے بھاگ کھڑے ہوئے ، ہم دونوں میڈرڈ کے میدانِ جنگ میں لڑتے رہے - وہ ہمیں ہرا نہ سکے - تم بھولتے ہو - میڈرڈ کبھی نہیں جیتا گیا ، وہ وہاں زندہ ہے ، میری چھاتیوں کی ہر بوند میں "

اس نے گلاس ختم کر دیا - میں نے بوتل پرے سرکا دی، " سو جاؤ کارمن ! "

" کون سوئے گا آج - وہ خندق دیکھ رہے ہو - دائیں طرف سائن میریا کا گرجا ہے، بائیں طرف تانبے کے مل کی ٹوٹی ہوئی دیوار - سامنے دشمنوں کی خندق بیچ میں انجیر کا پیڑ ، جہاں میرا منگیتر مرا تھا " " تمھارا منگیتر ! "

" اتنی جلدی بھول گئے - ڈان گریزیانو تو اتنی جلدی بھلا دینے والا جوان نہ تھا - وہ خوبصورت تھا، وہ دل کا خوبصورت تھا ، اس کی رائفل خوبصورت تھی - ہم سات دن لڑتے رہے ، کھانے کے لئے صرف تین بسکٹ ملتے تھے - ڈان گریزیانو ، جو خونی بیلوں سے لڑتا تھا ، آج بھی خونی بیلوں سے لڑ رہا تھا ــــ بوتل ادھر لاؤ ! "

میں نے بوتل اس کے سامنے رکھ دی -

" یہ بورکھے کی خالص شراب ہے " کتنا اچھا ذائقہ ہے اس کا ! پیاس بجھا دیتی ہے - لیکن اس وقت ہمارے پاس شراب تو کیا ، پانی کی بھی ایک بوند نہ تھی - پانی مل کے بھیتر تھا اور ڈان گریزیانو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتا تھا جب تک کہ کوئی اس کی جگہ پر نہ آ جائے - تب فوراً پانی لانے کے لئے اٹھی -

" نل سے پانی بھر کر لوٹ رہی تھی کہ دشمنوں نے ، جو مل کے اندر چھپے ہوئے تھے ، گولی

چلائی، یہاں بازو میں لگی، یہ نشان دیکھ سکتے ہو۔ پڑھ سکتے ہو یہ نشان کیا کہتا ہے ؟"
میں چپ تھا۔
"میں پانی لے آئی، لیکن جلدی میں غلط راستے سے بھاگی اور جب مل سے باہر نکلی تو دونوں خندقوں کے بیچ تھی اور سامنے انجیر کا پیڑ تھا۔ گریزیانو نے کہا، 'لیٹ جاؤ۔ میں گھٹنے لگی لیکن پانی برتن میں موجود تھا۔ دشمن گولیاں برسا رہا تھا۔ میں گھسٹ رہی تھی اور خون میرے بازو سے بہہ رہا تھا۔ پھر میں بیہوش ہوگئی۔ ڈان گریزیانو چیتے کی طرح لپک کر آگے بڑھا۔ سنسناتی ہوئی گولیاں نکل گئیں۔ اس نے مجھے اٹھایا اور واپس اپنی خندق کو چلا جیسے کوئی خونی بیل کو گھائل کر کے ایمفی تھیٹر سے باہر آ رہا ہو۔
"میں اس کی گود میں تھی۔ گولیوں کا سنگیت چاروں طرف تھا۔ گولی اس کی پیٹھ میں گھس گئی تھی۔ وہ مجھے شادی کی انگوٹھی پہنا رہا تھا، 'سنو، سنو، کارمن، میں مر رہا ہوں۔ آخری بارش لو کارمن! میں مر رہا ہوں۔ لیکن تم میری بیوی ہو۔'
"اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے مل گئے۔ میں نے اس کے گلے میں بانہہ ڈال کر کہا، میں تمھیں مرنے نہ دوں گی۔'
"وہ ہنسا، مجھے ایک سگریٹ دی اور دھیرے دھیرے سگریٹ پیتے ہوئے گانے لگا:

میرے چھوٹے سے سگریٹ کیس
آج تم بالکل خالی ہو
کل اتوار ہے لیکن
کل تمھیں بھر دوں گا (سگریٹوں سے)
آج میرے پاس صرف دو سگریٹ ہیں
جنھیں تین سپاہی پینا چاہتے ہیں۔
دو اور تین پانچ ہوتے ہیں!"

"کارمن! کارمن!"

وہ اُونچے ترنّم میں گا رہی تھی ۔ یہ یکایک خاموش ہوگئی ۔ پھر دھیرے سے بولی ، "وہ گیت گاتے گاتے مر گیا ۔"

"اور بالکل اسی وقت سان میریا کے گرجا کے گھنٹے جھنجھنا اُٹھے ، جس طرح آج دولہا کی آرتی کے وقت گھنٹے جھنجھنائے تھے ۔"

وہ تکئے میں سر چھپا کر رونے لگی ۔ پھر یکایک اس نے سر اُٹھایا اور میری طرف آگ بھری نظروں سے دیکھ کر بولی ، "کیوں مارتے ہیں وہ ، کیوں مارتے ہیں وہ ؟ اس طرح بچّوں کو مار دیتے ہیں ۔ لڑکوں کو گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں ، ماں باپ کو پھانسی پر چڑھا دیتے ہیں ۔ بہنوں کی عزّت لوٹ لیتے ہیں ، اوہ ! اوہ !! " ...

وہ زور زور سے رونے لگی ۔

"یہ جنگ ، مجھے اس سے نفرت ہے ۔ یہ جنگ کب ختم ہوگی ؟"

"ہو جائے گی ! "

"ہاں ہو جائے گی ٹونو ! " وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی ۔ اس کا ترنّم ایک دم بدل گیا ۔ وہ ایک عجیب ڈھنگ سے خوش ہو کر بولی ، "ہاں ضرور ہو جائے گی ٹونو ! ہو جائے گی ، جیسے آج تمھاری بہن کی شادی ہوگئی ہے ۔ میں آج بہت خوش ہوں ٹونو ! آج مجھے اپنا انجیر کا پیڑ مل گیا ہے ۔ ایلی کانتے کے بازار کا فرش زیڈ کی طرح چمک رہا ہے ۔ ہم گدھوں پر سوار ہو کر گرونو کیسپا کو جا رہے ہیں ۔ راستے میں درخت انجیروں سے لدے کھڑے ہیں اور ماحول گلاب کے پھولوں سے مہک رہا ہے ۔ آج میری شادی ہوئی ہے ٹونو ۔ سُنتے ہو ، آج میری شادی ہوئی ہے ۔ ڈان گریزیانو میری گود میں ہے ، اس کی شادی کی انگوٹھی میری انگلی میں ہے اور سان میریا کا گرجا گھنٹیاں بجا رہا ہے ۔ سُنتے ہو ٹونو ! یہ سان میریا کی گھنٹیوں کا ترنم .... یہ سان میریا کی گھنٹیوں کا ترنّم ہے ۔"

کارمن سوگئی ۔

دوسرے دن میں اس کے فلیٹ پر گیا لیکن وہاں کوئی نہ تھا ۔ گیٹ وے آف انڈیا پہنچا تو وہ اسی

طرح ناچ رہی تھی اور رجھا رہی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی اور سیاہ گھنگھریالے بال یوں جھٹکے لیتے جیسے دُنیا پر کالی بدلیاں چھا رہی ہوں، اور اپنے گیت میں موری نغمے کا وحشی لہراو کانپ جاتا تھا ـــ ایک پیشہ سینور!

اور چاروں طرف سے سکّوں کی بارش ہو گئی - ایک سکّہ میں نے بھی دیا۔ اس کی پتلی پتلی اُنگلیاں آگے بڑھیں، پھر رُک گئیں۔ وہ ایک اجنبی کی طرح سے آگے بڑھ گئیں جیسے اس نے مجھے کبھی نہ دیکھا تھا، نہ کبھی پہچانا تھا۔ دل کو سکون ملا۔ ایک سکّہ میں نے دیا، وہ سکّہ اس نے نہیں لیا۔ بات ختم ہو گئی۔ مجھے تجربہ ہوا جیسے بات ختم ہو گئی ہے، ہمیشہ کے لئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا آگے بڑھ گیا۔ گیٹوے آف انڈیا سے بہت دور آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور تک میں نے گیٹوے آف انڈیا اور کارمن اور اس ہجوم کو، جو اس کے گرد تھا، اپنے ساتھ ساتھ تٹ کی ریت پر چلایا۔ پھر گیٹوے آف انڈیا اور وہ ہجوم ـــ غائب ہو گیا اور صرف کارمن رہ گئی جو دور تک میرے ساتھ سمندر کی لہروں پر چلتی گئی۔ پھر وہ بھی اوپر اٹھ کر آسمان کے بادلوں پر اڑنے لگی اور پھر تاروں میں جا کر غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا اور لہریں عجیب سے راگ الاپنے لگیں اور تارے پلکیں جھپک جھپک کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

اور دور کہیں بہت دور، سانتا میریا کے گرجا کے گھنٹے بجنے لگے!

فن

● "کرشن چندر میں سب سے مقدم چیز اُن کا منفرد نقطۂ نظر ہے۔ وہ سب سے پہلے بھی کرشن چندر ہے اور سب سے آخر میں کرشن چندر۔ اس نے مخصوص تحریک یا نقطۂ نظر کو اپنے اُوپر غالب نہیں ہونے دیا ہے۔ نہ تو پرولتاریت کو، نہ جنس کو، نہ رومانیت کو، محض ترقی پسندی کو بھی نہیں۔ وہ زندگی کو دیکھنے کے لئے کسی مخصوص رنگ کے شیشوں کی مدد نہیں لیتا۔ اُس کو اپنی آنکھوں پر پورا اعتماد ہے۔ اس کا افسانہ زندگی کا ایک ذاتی اور بلاواسطہ تاثر ہوتا ہے۔"

—— محمد حسن عسکری

● "فن اور وسیلۂ اظہار کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی مواد اور موضوع کی۔ بلکہ اس میں تو ایسا جادو ہے کہ کبھی کبھی یہ مواد کی سطحیت کا پردہ پوش بن جاتا ہے۔ اور زبان و بیان کے رسیا اسی کے چند گھونٹ پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو تنہا اسلوب پر فن کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے نہ اُس کو نظر انداز کر کے۔ کرشن چندر افسانہ نویسی کے اس اہم ترین بھید سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُس کو برتنے پر قدرت رکھتے ہیں۔"

—— سیّد احتشام حسین

● "کرشن چندر اندر سے سراسر شاعر تھا۔ اُس نے اپنے افسانوں سے شاعری کی شبنم جھاڑنے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہا۔ اور اچھا ہی ہوا کہ ناکام رہا اور اس طرح محبت، اپنائیت اور اجتماعیت اس کے افسانوں کا مجموعی تاثر بنی۔"

—— احمد ندیم قاسمی

● "وہ اپنے خوبصورت اندازِ بیان کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کے اسٹائل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو عموماً ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں مثلاً رُومان، مزاح اور حقیقت۔ مزاح ایک ایسا عنصر ہے جو رُومان کے حق میں زہرِ قاتل ہوتا ہے۔ اور رُومان وہ عنصر ہے جو حقیقت کو تباہ کر دیتا ہے لیکن کرشن چندر کے اسلوبِ بیان میں وہ نہ صرف اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ گھُل بیٹھتے ہیں۔ کرشن چندر قدرت سے ایک شاعر کا دل، ایک فلسفی کا دماغ اور ایک مجاہد کا جگر لے کر پیدا ہوئے تھے۔ یہ نظریۂ اشتراکیت کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے کرشن چندر ایسا مبصّر اور مبلغ ملا جس نے کارل مارکس کے خشک اور سنجیدہ فلسفہ کو اس دلکشی اور رعنائی کے ساتھ پیش کیا کہ وہ عمر خیّام کی رُباعی اور شعرِ حافظ سے بھی زیادہ دلآویز نظر آنے لگا۔"

—— کنہیّا لال کپور